عصمت چغتائی
کے ناولوں اور افسانوں میں
نسائی حسیت
عطیہ فاطمہ

عصمت چغتائی کے ناولوں

اور

افسانوں میں نسائی حسّیت

عصمت چغتائی

کے ناولوں اور افسانوں میں

نسائی حسیت

عطیہ فاطمہ

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

یہ کتاب اردو اکیڈمی تلنگانہ کے جزوی مالی اعانت سے شائع ہوئی۔

ISMAT ÇHUGTAI KE NOVELOUN
AUR AFSANAOUN ME NISAI HISSIYAT

by

Atiya Fatima

Year of Edition 2019
ISBN 978-93-89002-96-6

₹ 250/-

نام کتاب	:	عصمت چغتائی کے ناولوں اور افسانوں میں نسائی حسیت (تحقیق وتنقید)
مصنفہ	:	عطیہ فاطمہ
سنہ اشاعت	:	۲۰۱۹ء
صفحات	:	۲۰۰
قیمت	:	۲۵۰ روپے
سرِورق	:	غوث ارسلان
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔۶
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

ملنے کا پتہ

مصنفہ: عطیہ فاطمہ، 54-2-17، چھاؤنی نادِعلی بیگ یاقوت پورہ، حیدرآباد۔500023

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

H.o. D1/16, Ansari Road, Darya Ganj, New Delhi-110002 (INDIA)
B.o. 3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 45678285, 45678286, 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

اردو دنیا کے ممتاز نامور افسانہ نگار استاد محترم

پروفیسر ڈاکٹر بیگ احساس صاحب

جنھوں نے مجھے اولاد معنوی سمجھا

اور

والد احمد محی الدین صاحب مرحوم

بڑے بھائی سلطان محی الدین صاحب مرحوم

جن کی بے وقت موت نے مجھے صدمہ سے دوچار کیا

کے نام

سماج کی دکھتی رگوں میں نشتر کی طرح
اتر جانے والا بے باک قلم

فہرست

پیش لفظ

فیمنزم یا نسائیت سے مراد وہ حقوق نسواں ہے جو خواتین کے خلاف برتے جانے والے امتیازات کے خاتمہ کی دلالت کرتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر خواتین کو بھی وہی معاشی، معاشرتی اور سیاسی حقوق ملنے چاہئے جو مردوں کو حاصل ہیں۔ زمانہ قدیم ہی سے ہندوستانی معاشرہ پر مردوں کا تسلط رہا ہے۔ عام زندگی کے علاوہ ادب میں بھی عورت دبیز پردوں میں لپٹی نظر آتی ہے۔ بیسویں صدی کے ادیبوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ عورت پر پڑے ان پردوں کو اٹھایا۔ خواتین کے مختلف کرداروں کو ادب میں سمو کر اصلاحات کا سلسلہ ڈپٹی نذیر احمد کے دور ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ہمارے سامنے کئی ایک خواتین کے نام آتے ہیں جنھوں نے نثر اور نظم دونوں میں نہ صرف خواتین کی نمائندگی کی بلکہ ان کے مسائل کو بھی اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ اردو میں خواتین کے تخلیق کردہ عصری ادب کا آغاز ترقی پسند تحریک سے ہوتا ہے۔ ترقی پسند ادب کے فروغ کا اہم موڑ انگارے کی اشاعت تھا۔ انگارے کے قلم کاروں نے ہندوستانی روایات سے بغاوت کی۔ متعدد خاتون قلمکاروں نے ترقی پسند ادبی تحریک میں سرگرم حصہ لے کر ان تمام مسائل کو اپنی تحریروں کا

موضوع بنایا جو ممنوع سمجھے جاتے تھے۔ اظہار خیال کی آزادی، حقوق نسواں کے لئے اور جنسی امتیاز کے خلاف آواز اٹھائی گئی ان کی تحریریں سماج کے دبے کچلے و مجبور طبقے کے لیے امید کی کرن تھیں۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ خاتون لکھنے والوں میں رشید جہاں، عصمت چغتائی، رضیہ سجاد ظہیر، صدیقہ بیگم، سیوہاروی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور ممتاز تھیں۔ رشید جہاں خاتون ترقی پسند ادیبوں کی سرخیل اور بعد کے لکھنے والوں کے لئے رول ماڈل تھیں۔ اس عہد کے لکھنے والوں کا بنیادی مقصد خواتین کے مسائل پر اظہار خیال تھا۔ رشید جہاں کی اولین روحانی جانشین عصمت چغتائی تھیں۔ عصمت چغتائی نے بچپن ہی سے لڑکیوں کے مشاغل سے انحراف کرتے ہوئے اپنے بھائیوں کی ڈگر کو اپنایا۔ کم عمری میں جب عصمت کی شادی طئے کی گئی تو انھوں نے اس سے انکار کر دیا یہ پہلی بغاوت تھی۔ عصمت نے اپنی کہانیوں کے اکثر کردار متوسط طبقہ سے اخذ کر کے جرأتمندی سے پیش کیا انھوں نے وہی لکھا جو اپنے اردگرد دیکھتی اور محسوس کرتی تھیں۔ ان پر فحش نگاری کا الزام لگا کر مقدمے بھی چلائے گئے لیکن ان کا قلم کبھی نہیں رکا۔ انھوں نے وہ سب کچھ لکھا جس کا تصور بھی اس وقت نہیں کیا جا سکتا تھا۔

تقریباً پچیس سال قبل ایم فل کے مقالے لئے موضوع کا انتخاب کرنا تھا۔ میں نے اپنا مطمع نظر پیش کیا کہ ایسا موضوع منتخب کرنا چاہتی ہوں جس میں متوسط طبقہ کی عورت کا جائزہ لیا جائے کیوں کہ ہندوستانی سماج میں عورت بڑی گھٹن محسوس کرتی ہے خاص طور متوسط مسلم طبقہ کی عورت جس کیفیت سے دوچار ہوتی ہے اور اس معاشرہ میں خود کو دبی کچلی محسوس کرتی ہے۔ استاد محترم پروفیسر مغنی تبسم صاحب نے مقالے کا عنوان ''**عصمت چغتائی کے ناولوں اور افسانوں میں نسائی حیسّت**'' تجویز کیا۔ عصمت کا تذکرہ آتے ہی سوچا۔

''زباں پہ بارِ خدایہ کس کا نام آیا''

عصمت کے ناولوں وافسانوں کی تفسیر وتشریح ایک تفصیلی مرحلہ ہے اس کے لئے

عصمت کو پڑھنا مسلم گھرانوں میں شجر ممنوعہ تھا۔ میں نے اس موضوع پر کام کرنے کی حامی بھرلی۔ میرا تعلق ایک علمی گھرانے سے ہے جہاں ہر طرف دینی و دنیاوی تعلیم کا بول بالا تھا۔ میرے دادا بیرسٹر تھے۔ میری پرورش حیدرآباد میں معظم جاہی مارکٹ مسجد فصیح جنگ سے متصل گلی میں ہزاروں گز زمین پر محیط حویلی میں ہوئی۔ اس وقت ہمارے خاندان کے بیشتر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ڈاکٹر اور انجینئر بن چکے تھے۔ میں واحد لڑکی تھی جو ادب سے جڑی تھی ایم اے کے بعد ایم فل میں داخلے پر سب نے میری ہمت افزائی کی۔ میرا ماننا تھا کہ جب شریف گھرانے کی لڑکیاں ڈاکٹری کی تعلیم کے دوران برہنہ انسانی جسم کی چیر پھاڑ کرسکتی ہیں تو ایک ادب کی طالبہ عصمت چغتائی یا منٹو پر کام کیوں نہیں کرسکتی۔ میں نے جس موضوع کا انتخاب کیا تھا وہ نسائی حسیّت Feminine Sensibility تھا۔ جو بالکل نیا تھا۔ اردو میں نسوانی کرداروں کا تجزیہ، اصلاح نسواں اور بیداریٔ نسواں پر تحریریں تھیں لیکن نسائی حسیّت پر ایک لفظ بھی نہیں تھا، پھر فکشن میں تنقید نہ ہونے کے برابر تھی۔ جو بھی کرنا تھا مجھے ہی کرنا تھا اپنے استاد محترم ڈاکٹر بیگ احساس صاحب کی نگرانی میں یہ کام کیا۔ مجھے تو اپنے احساسات کو لفظی پیکر دینے کا فن بھی نہیں آتا تھا۔ کچھ انگریزی کتابوں سے مدد لینے کی کوشش کی۔ ایم۔ اے کی تکمیل کے فوراً بعد میں مدینہ پبلک اسکول حمایت نگر میں پڑھانا شروع کردی تھی سکریٹری جناب عارف الدین صاحب نے آخری دو پیریڈ کی چھٹی دے رکھی تھی ــــ اسکول سے سیدھا آرٹس کالج جاتی وہاں سے انڈو امریکن لائبریری جہاں اس موضوع پر انگریزی کتب سے مدد ملتی، اس زمانے میں سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں ۳۰، ۴۰ صفحات لکھ لیتی پھر گھر آکر ترجمہ کرتی۔ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں کتب خانہ کے نگران مرحوم سرور صاحب تھے انھوں نے مطلوبہ کتب کی فراہمی میں مدد کی جن میں نسائی حسیت پر مبنی کچھ خاتون افسانہ نگاروں کے افسانے اور ناولیں تھے جن سے استفادہ کیا کچھ خود پر اور زیادہ اپنے نگران پر، بھروسہ کیا۔ اللہ کا فضل ہے کہ یہ رائیگاں نہیں ہوا۔

کئی مرتبہ عصمت کے ناولوں اور افسانوں میں نسائی حسیّت تلاش کرتے کرتے خوفزدہ ہو کر سوچنا پڑا مجھ جیسی لڑکی کو اس موضوع پر کام کرنا چاہئے یا نہیں۔ لیکن جیسے جیسے میں نے اس پر کام کیا دلچسپی میں اضافہ ہوتا گیا۔ بہر حال میں نے اس ٹیڑھی لکیر کو سمجھنے کی کوشش کی۔

اس مقالے کو سات ابواب میں تقسیم کیا گیا۔ پہلا باب۔ ''قدیم ہندوستانی سماج میں عورت کا تصور'' اس باب میں ویدک زمانہ، بدھ مت، جین مت اور عہد وسطیٰ سے لے کر انگریزوں کے زمانے تک مختلف ادوار میں عورت کی بدلتی ہوئی حسیّت کا جائزہ لیا گیا۔

دوسرا باب۔ ''ہندوستان میں آزادی نسواں کی تحریک'' ہندوستانی خواتین کے بیدار نسواں کی جو تحریک چلی جو مسائل تھے مثلاً اطفال کشی، بچپن کی شادی، کثرت ازواج، ستی کی رسم پردے کی رسم، خواتین کی تعلیم وغیرہ کا جائزہ لیا گیا۔ جدوجہد آزادی میں جن عورتوں نے حصہ لیا اس کا ذکر کیا گیا۔ کیونکہ جدوجہد آزادی اور تحریک نسواں ایک دوسرے میں شیر وشکر کی طرح ملے ہوئے ہیں۔

تیسرا باب ''نسائی تحریک کے مختلف رجحانات کا جائزہ'' جدید و معتدل نسائی تحریک، اشتراکی نسائی تحریک اور انتہا پسند نسائی تحریک کا مختصراً جائزہ لیا گیا کیوں کہ یہ تحریکیں نسائی حسیّت کی دریافت میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ جوتھا باب ''نسائی حسیّت'' کی تعریف تجزیہ اور وضاحت''۔ یہ تجزیہ اس مقالے کا اہم حصہ ہے پانچواں باب ''عصمت سے قبل ناولوں اور افسانوں میں نسائی حسیّت سے متعلق ہے۔

چھٹواں باب ''عصمت چغتائی کے ناولوں میں نسائی حسیّت'' اس باب میں سب سے اہم ''ٹیڑھی لکیر'' ہے جس میں عصمت کی نسائی حسیّت عروج پر نظر آتی ہے۔ وہ سارے موضوعات اور امکانات کو عصمت نے اپنے ناولوں میں برتتے ہیں وہ سب اس ناول میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ، ضدی، جنگلی، کبوتر، اور معصومہ میں عصمت چغتائی کی نسائی حسیّت کی نشاندہی ہی کی گئی ہے۔

ساتواں باب ''عصمت چغتائی کے افسانوں میں نسائی حسیّت'' موضوعات کے لحاظ سے افسانوں کا تجزیہ کیا گیا۔ عصمت چغتائی وہ واحد افسانہ نگار ہیں جنھوں نے عورت کو ہر روپ میں پیش کیا۔ مختلف طبقات کی عورتیں جیسے دھوبن، مہترانی، مشاطہ، آیا، اناّبی، دائی، کلرک، طوائف، ٹیچر غرض ہر طبقہ کی عورت ان کے افسانوں میں ملتی ہے۔ عورت کے جتنے رشتے ہو سکتے ہیں جیسے دادی، نانی، پھوپھی، خالہ ممانی، چاچی، بیوہ، بہن وہ سب عصمت کے افسانوں میں موجود ہیں۔ ان کے افسانوں اور ناولوں کے کردار کو میں اپنے آس پاس محسوس کرتی تھی۔ ''چوتھی کا جوڑا'' ایسا ہی واقعہ ہمارے ہاں گھریلو ملازمہ کے ساتھ پیش آیا تھا ''چٹان'' کے کردار تو آس پاس بھرے پڑے ہیں۔

اس مقالے کی تیاری میں مجھے بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ میرے نگران پروفیسر بیگ احساس صاحب نے ہر قدم پر رہنمائی فرمائی اور موضوع کی اہمیت وقدر و قیمت کا احساس دلایا۔ پروفیسر بیگ احساس صاحب جو خود بھی اردو دنیا کے ممتاز نامور افسانہ نگار ہیں اس موضوع کو چیلنج کی طرح قبول کیا۔ مقالے کی تیاری کے دوران میں اپنے والد محترم جناب احمد محی الدین صاحب کے سایۂ شفقت سے محروم ہو کر ٹوٹ گئی تھی اور کام سے دل اکتا گیا تھا محترم بیگ احساس صاحب نے میری ڈھارس باندھی اور ایم فل کی تکمیل کے لئے آمادہ کیا۔ ان کی ہمت افزائی نہ ہوتی تو شاید میں یہ کام مکمل نہ کر پاتی۔

مقالے کی اشاعت میں ربع صدی تاخیر کی وجہ رشتہ ازواج سے منسلک ہو کر سعودی عرب منتقلی ہے۔ قیام سعودی عرب کے دوران گھریلو مصروفیات کی وجہ اس جانب توجہ نہیں دی گئی۔ نسائی حسیّت پر اردو میں غالباً یہ پہلا مقالہ تھا اس سے قبل اردو میں نسائی حسیّت پر نہ تو کوئی کتاب اور نہ ہی مبسوط مضامین دستیاب تھے۔ بعد ازاں کئی ریسرچ اسکالرس نے اس موضوع پر تحقیق کی اور مقالوں کو شائع بھی کروایا ان کے لئے میرا مقالہ سر چشمہ تھا۔ بیشتر افراد نے اپنی کتابوں میں ابواب من وعن نقل کئے لیکن کسی نے حوالہ دینا تک مناسب نہیں سمجھا آج وہی لوگ جامعات میں تدریسی عہدوں پر فائز ہیں۔ شعبہ اردو جامعہ

عثمانیہ میں داخل کی گئی مقالے کی کاپی سے صفحات پھاڑ کر غائب کر دئے گئے۔ ادبی سرقہ کی اس سے بہترین مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ احباب نے قانونی چارہ جوئی کا مشورہ دیا لیکن میں نے اسے شائع کروانا بہتر سمجھا۔

مرحوم مشفق اساتذہ اکرام پروفیسر مغنی تبسم صاحب اور پروفیسر سیّدہ جعفر صاحبہ نے اکثر و بیشتر مجھے اس موضوع سے متعلق مفید معلومات سے نوازا۔ پروفیسر مغنی تبسم صاحب کا تجویز کردہ عنوان نسائی حسیت بعد کے آنے والے ریسرچ اسکالرس کے لئے محرک بنا۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ مرحومین کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ پروفیسر اشرف رفیع صاحبہ جنھوں نے فیمینزم پر ہندوستان بھر میں پہلا سیمینار منعقد کیا تھا مجھے مفید مشوروں اور کتابوں سے نوازتی رہیں۔ پروفیسر عقیل ہاشمی صاحب کا تعاون اور مشورے بھی شامل حال رہے میں ان تمام اساتذہ کی شکر گزار ہوں۔ میرے افراد خاندان والدہ محترمہ، بڑی بہنیں الیاس فاطمہ اور شہانہ دونوں بھائی سلطان محی الدین مرحوم اور سمیع محی الدین نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی اور تعاون کیا۔ میرے شریک سفر غوث ارسلان کی شکر گذار ہوں جن کے ادبی ذوق نے مجھے ادبی دنیا سے روشناس کروایا۔ تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی، میری عزیز دوست رضوانہ کبیر، بھانجہ محمد یونس عادل اور ڈاکٹر ایم اے۔ قدیر کی بھی ممنون ہوں جن کے تعاون کے بغیر اشاعت ناممکن تھی۔

عطا فاطمہ

ایم اے۔ ایم فل، عثمانیہ

حیدر آباد

پهلا باب

قدیم ہندوستانی سماج میں عورت کا تصور

ہندوستانی تہذیب اتنی ہی قدیم ہے جتنی یونانی تہذیب۔ ہندوستان کی قدیم تہذیب کے بارے میں ہمیں ویدوں سے پتہ چلتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قدیم ہندوستانی سماج میں عورت کی حیثیت مرد کے مقابلے میں کمتر تھی۔ لیکن ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں عورت کا مرتبہ بلند تھا۔ ڈی۔ ڈی کوسامبی D.D. Kosambi کے مطابق ''زراعت کپڑے کی بنائی اور برتن سازی کا ہنر عورت سے منسوب تھا۔

"Agriculture was then the monoply of women.

women was the first potter and weaver" [1]

ویدک زمانے میں عورت اور مرد مساویانہ درجہ رکھتے تھے۔ مذہبی امور کی انجام دہی میں مرد اور عورت یکساں حصہ لیتے تھے۔ مذہبی تقاریب میں عورتوں کی شرکت اہم اور ضروری سمجھی جاتی تھی تعلیمی اعتبار سے بھی عورتیں مرد سے پیچھے نہ تھیں۔

---

[1] Kosambi. D.D —"The Culture and civilization of ancient India" P: 45

اس زمانے کے حالات اور رسم و رواج کی تفصیل اپنیشدوں سے مل جاتی ہے۔ قدیم ہندوستان میں فلسفیوں کی ایک کانفرنس کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ جو ویدھا کے راج رشی جنک نے منعقد کی تھی۔ اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ مختلف مذاہب و عقائد رکھنے والے دانشوروں کو یکجا کیا جائے اور ان کے خیالات و اختلافی نظریات کو اکٹھا کیا جائے انہیں با ضابطہ تحریری شکل دی جائے اور اختلافات کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ ڈاکٹر شمیم نکہت اسی کانفرنس کے بارے میں لکھتی ہیں:

> اس کانفرنس کی سب سے بڑی اہمیت یہ تھی کہ اس میں ایک فلسفی خاتون برہم ویدنی گارگی وشا کنوی (Braham Vadni Gargi Vishanavi) نہ صرف شریک ہوئیں بلکہ اس نے مباحثوں میں بھی حصہ لیا [1]

> رادھا کمند مکرجی لکھتی ہیں: ''رگ وید سے ایسے بہت سے ثبوت ملتے ہیں جس میں مرد و عورت کے درجے مساوی ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ عورتیں بھی اتنی ہی معلومات رکھتی تھیں جتنے مرد—'' [2]

عورتوں کو بھی رشی قرار دیا گیا تھا۔ اس دور میں فلاسفر عورتوں کو برہماویدنی کہا جاتا تھا۔ اس دور کی قابل عورتوں میں لوپا مدرا (Lopamudra) اپاٹا (Apata) کدرو (Kadru) گھوشا (Ghosha) پاولومی (Paulomi) وغیرہ تھیں۔ سب سے مشہور فلاسفر گارگی (Gargi) تھیں۔ [3]

کوٹلیا کی اردو شاستر (تین سو قبل مسیح) میں ایسی عورتوں کا بھی تذکرہ ملتا ہے جو سپاہی تھیں اور باضابطہ تیر اندازی کے فن سے واقف تھیں بہت سی عورتوں نے اس زمانے

---

[1] ڈاکٹر شمیم نکہت: پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار۔ ص۔ ۲۴

[2] Tara Ali Baig— Women in Ancient India- P. 1...

[3] Rao Shakuntala — Women in the Vedic Age —1960 - P. 27.....

میں مختلف شعبہ ہائے حیات میں نمایاں کام انجام دیے ان میں اساتذہ، رقاصائیں اور گلوکارائیں بھی شامل تھیں۔ ویدک زمانے میں ستی کی رسم کا تصور بھی نہ تھا۔ شکنتلا راؤ لکھتے ہیں: ''رگ وید میں کسی مقام پر بھی بیواؤں کے شوہروں کے ساتھ زندہ جل جانے یا خودکشی کرنے کا تذکرہ نہیں ملتا'' [1]

اس زمانے میں عورت کو اپنے شوہر کے انتخاب کا پورا حق حاصل تھا۔ لڑکی کی مرضی کے مطابق شادی ہوتی تھی۔ کبھی ایک لڑکی کے کئی خواستگار ہوتے تو لڑکی ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتی تھی۔ اس طریقۂ انتخاب کو سوئمبر کہا جاتا تھا۔ سیتا، درو پدی، ساوتری، رکمنی وغیرہ نے اسی طریقے سے اپنے شوہر کا انتخاب کیا تھا۔ موسیقی اس زمانے میں تعلیم کا اہم جز سمجھی جاتی تھی۔ رِگ وید میں مختلف جگہوں پر اس بات کا تذکرہ ملتا ہے کہ عورتیں نہ صرف گانے کی ماہر تھیں بلکہ مختلف سازوں کے استعمال سے بھی بخوبی واقف تھیں۔ اپالا، اندرانی، وشواورا وغیرہ نے بہت سے بھجن لکھے جو ویدوں میں شامل ہیں۔ مہابھارت میں اترا اور اس کی سہیلیوں کا تذکرہ ملتا ہے جو رقص اور موسیقی میں ماہر تھیں۔ ویدک زمانے میں عورت مرد کے تابع نہیں تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ عورت کا سماجی مرتبہ گھٹتا گیا۔ عورت صرف مرد کی خواہشات کو پورا کرنے کا آلہ بن کر رہ گئی۔ یہ سمجھا جانے لگا کہ عورت کسی مرد کے سہارے کے بغیر زندگی نہیں گذار سکتی۔ وہ خود اپنی کفالت نہیں کر سکتی اس لئے بچپن اور نوجوانی میں اس کی پرورش اور حفاظت کرنے والا اس کا ''باپ'' ہوتا ہے۔ جوانی میں وہ شوہر کی دستِ نگر ہوتی ہے اور بڑھاپے میں لڑکا اس کا سہارا بنتا ہے۔ اسمرتھیوں اور اپنیشدوں میں شادی شدہ عورت کے حقوق میں کمی کر دی گئی۔ مرد کو یہ حق دے دیا گیا کہ وہ کسی وقت بھی دوسری شادی کر سکتا ہے لیکن عورت کسی حالت میں اپنے شوہر کو نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ شوہر کے مرنے کے بعد بھی اس کا رشتہ قائم رہتا تھا۔

منو جو اس زمانے کا زبردست عالم تھا اور جس کے الفاظ اس زمانے میں قانون کا

---

[1] Rao Shakunthla — Women in the Vedic Age- 1960- p-27

درجہ رکھتے تھے عورتوں کا سخت مخالف تھا۔ اس نے عورتوں کو بہت زیادہ برا بھلا کہا۔ منو نے بین جاتی شادیوں کی مخالفت کی اور نچلی ذات میں شادی کرنے کو سختی سے منع کیا عورتوں کی سماجی حیثیت کے کم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آریا اور غیر آریاؤں کے درمیان جنگیں شروع ہوگئی تھیں۔ آریا، غیر آریا کو خود سے کم تر سمجھتے تھے۔ غیر آریائی عورتوں سے شادی نہیں کرتے تھے۔ غیر آریائی عورتیں مذہبی رسومات کی ادائیگی میں حصہ نہیں لے سکتی تھیں کیوں کہ وہ سنسکرت سے واقف نہیں تھیں۔ رفتہ رفتہ آریائی عورتوں کا مذہبی امور میں حصہ لینا ممنوع قرار دیا گیا۔ عورت کے رتبے میں کمی کی ایک وجہ بچپن کی شادی کا رواج بھی ہے یہ سلسلہ چار سو قبل مسیح سے شروع ہوا اور سو عیسوی تک مسلسل فروغ پاتا رہا۔ بچپن کی شادی کے بارے میں رائے عامہ ہموار ہونے لگی آہستہ آہستہ اسے سماجی قانون کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ دو سو عیسوی میں عورت سے شوہر کے انتخاب کا حق بھی چھین لیا گیا ماں باپ شادیاں طے کرنے لگے یہ تصور کیا جانے لگا کہ کچی عمر کی لڑکیاں اپنے شوہر اور اس کے رشتے داروں کے ساتھ با آسانی ہم آہنگی پیدا کرسکتی ہیں۔ دو سو عیسوی میں ہی جہیز کی رسم کا آغاز ہوا۔ ”برہما پرانا میں اس بات کا تذکرہ ملتا ہے کہ سُر سینا نے اپنی بیٹی کے ساتھ گائے، سونا، کپڑے، گھوڑے اور دیگر سامان دیا تھا اور سانبھا نے اپنی بیٹی کی شادی دریودھنا سے کی تو جہیز میں کافی دولت دی“ [1]

منو کے علاوہ تلسی داس بھی اس بات کا حامی تھا کہ عورت کو قابو میں رکھنا چاہیے۔ برہما پرانا میں اس بات کی سفارش کی گئی ہے کہ عورت کو اپنے شوہر کی خاطر قربانی دینی چاہیے۔ عورت کو حفاظت کی خاطر حرم میں رکھنا چاہیے عورت کو تنہا پا کر چونکہ مرد خود پر قابو نہیں رکھ سکتا اس لئے عورت کو چاہیے کہ وہ اپنے شوہر کے علاوہ کسی دوسرے مرد کا چہرہ نہ دیکھے۔ [2]

---

1. Seth Surabhi — "Religion and Society in The Brahama Purna" - 1979- P. 91

2. Seth Surabhi "Religon and Society in the Brahama Purana" P.108"

بدھ مذہب میں عورتوں کی حیثیت نسبتاً بہتر تھی۔ بدھ مذہب کی بنیاد اگرچہ برہمن دھرم کے خلاف تھی لیکن انہوں نے عورت کو بہتر سماجی درجہ دیا۔ عورتوں کو اعلیٰ مذہبی تعلیم حاصل کرنے اور مقدس کتابیں پڑھنے کی اجازت تھی۔ عورتیں بھکتی سنگھ میں داخل ہوسکتی تھیں۔ گاتھاؤں میں ایسی عورتوں کا ذکر ملتا ہے جنھوں نے مذہبی رہنما کی حیثیت سے اصلاحی تحریک چلائی تھی یہ عورتیں تبلیغ کا کام بھی کرتی تھیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بدھ دور میں عورتوں اور مردوں کو برابر کا درجہ حاصل تھا۔ مسز وجے لکشمی پنڈت لکھتی ہیں:

بدھ کے زمانے میں عورت نے بہت زیادہ ذہنی ترقی کی انہوں نے تہذیبی امور میں اہم جگہیں حاصل کیں اس لئے سنسکرت ادب میں اور اس زمانے کے ڈراموں میں تعلیم یافتہ بدھ عورتوں کو اونچا درجہ حاصل ہے''۔[1]

جینی عہد میں بھی عورتیں فنونِ لطیفہ میں دلچسپی لیتی تھیں۔ بدھ مت کی تبلیغ میں جن عورتوں نے نمایاں کارنامے انجام دیے ان میں دھرم پالا، انوپما، کوئین کھیما اور چاپا وغیرہ شامل ہیں۔[2]

جینی عہد کی عورتوں کے بارے میں ڈاکٹر شمیم نکہت لکھتی ہیں۔

''اس زمانے میں جین عورتوں نے فنِ تعمیر میں نمایاں طور پر حصہ لیا ان میں ایک جینی جنرل گنگاراج کی بیوی لکالی (Lakkali) بہت مشہور ہے انہوں نے ایک مشہور جینی تیرتھ گاہ تعمیر کروایا تھا۔''[3]

---

[1] Vijay Lazmi Pandith — Introduction, The Status of Women in Aincient India

[2] Horner I.B— "Women Under Primitive Buddhism" P. 104 (London)

[3] ڈاکٹر شمیم نکہت۔ پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار'' ص۔۳۵

جینی عہد میں بعض عورتیں بہت اچھی مصوّر تھیں۔

دور وسطیٰ میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ عورت کی حیثیت میں بھی فرق آیا۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد مسلسل جنگیں ہوتی رہیں۔ مرد جنگوں میں کام آجاتے اور فاتح افواج مفتوح عورتوں پر قبضہ کرلیتی تھیں ہندوستان میں موجود حکومتیں غیر مستحکم ہونے لگیں معاشی حالات پر بھی اثر پڑا۔ مردوں کے جنگ میں کام آجانے سے عورتیں بیوہ ہو جاتی اور معاشی بدحالی کا شکار ہوکر ذلّت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔ غیر ملکی حملہ آوروں سے اپنی عورتوں کو محفوظ رکھنے کے لئے ہندوستانی سماج میں مختلف رسومات پرورش پانے لگیں جیسے اطفال کشی، بچپن کی شادی ستی کی رسم، پردہ، عورتوں کو غیر تعلیم یافتہ رکھنا۔ ایسی لڑکیاں جو بچپن میں بیوہ ہو جاتی تھیں ان کی دوسری شادی کا تصور ہی ختم ہو گیا۔ بیواؤں کا زیادہ تر وقت عبادت اور اپنے شوہر کو ثواب پہنچانے والی رسموں کی ادائیگی میں صرف ہوتا۔ بیوہ عورتوں کے سر منڈھ دیے جاتے انھیں اتنی اذیتیں دی جاتی تھیں کہ ایسی زندگی پر شوہر کے ساتھ جل جانے کو عورتیں ترجیح دینے لگیں۔ ستی کی رسم جسے عورت نے اپنی مرضی سے اختیار کیا تھا اسے رفتہ رفتہ قانونی حیثیت حاصل ہوگئی۔ عورت آہستہ آہستہ مکمل طور پر مرد کی تابع ہوتی گئی۔ اس کی پیدائش، زندگی اور موت کا مقصد صرف مرد کی خوشنودی اور تابع داری بن گیا۔ چند اہم رسمیں جو عورت کے گلے میں غلامی کی طوق بنی ہوئی تھیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) اطفال کشی (۲) بچپن کی شادی (۳) بیوہ (۴) دیوداسی
(۵) تعلیم پر پابندی (۶) پردہ

اطفال کشی:-

اطفال کشی کا رواج شمالی ہندوستان میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ لڑکیوں کو پیدائش کے فوری بعد ختم کردیا جاتا تھا۔ یہ سمجھا جانے لگا کہ سماجی دوڑ میں صرف لڑکوں کے ذریعہ ہی

سبقت حاصل کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ لڑکے کی پیدائش پر خوشیاں منائی جاتی تھیں۔ مذہبی و آخری رسومات کی ادائیگی کے لیئے لڑکے کا ہونا بے حد ضروری سمجھا جانے لگا۔ لڑکے کے ذریعہ ہی نجات حاصل ہوسکتی ہے۔ اگر کسی کو لڑکا نہ ہوا ہو تو وہ کسی اور کو گود لے سکتا ہے۔ لڑکے کے ذریعہ ہی دنیا سے نجات اور سورگ (جنت) مل سکتی ہے۔ لڑکے کی غیر موجودگی میں ان رسومات کی تکمیل ممکن نہیں۔ اگر کسی کو لڑکا نہ ہوتا تو وہ کسی اور لڑکے کو گود لے لیتا۔ ہندو خاندان میں لڑکے کا وجود بے حد ضرری تھا۔ دوسری طرف لڑکی کی پیدائش پر ماتم کیا جاتا تھا۔ لڑکی کو معاشی بوجھ تصوّر کیا جاتا تھا۔ بین فرقہ جاتی شادی ممنوعہ قرار پائی تھی اس لئے بھی لڑکیوں کی شادی مسئلہ بن گئی تھی۔ مسلمانوں میں سیّد خاندان کے افراد دوسرے خاندان میں اپنی لڑکی کی شادی کرنا خلافِ شان سمجھتے تھے۔ اونچی ذات کے ہندوں کے پاس لڑکی کا پیدا ہو جانا ایک حادثہ تصوّر ہوتا تھا۔ وہ یہ سوچتے تھے کہ ان کی لڑکی جس خاندان میں بیاہی جائے گی ان کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ راجپوت اور دوسری ذاتوں کے ہندو یہ سمجھتے تھے کہ لڑکا نچلی ذات کا ہے تو ان کی ذات میں کھوٹ آجائے گا۔ چنانچہ اطفال کشی اُتر پردیش، پنجاب، راجستھان اور گجرات میں عام تھی خاص طور پر راجپوت چھتری، بیدی اور سودھی (سکھ) جاٹ اور سیّد مسلمان وغیرہ کے پاس یہ رواج عام تھا۔ اس کی اجازت نہ مذہب نے دی اور نہ سماج نے لیکن مذہبی اور سماجی حلقے اس کو برداشت کرنے پر مجبور تھے۔ ڈاکٹر منموہن کور نے اطفال کشی کے مختلف طریقے بیان کئے ہیں:

۱۔ جیسے ہی لڑکی تولد ہوتی اسے بھنگ کی ایک گولی دی جاتی یا بچے کے حلق میں تمبا کو لگا دیا جاتا جس کی وجہ سے اس کی موت عمل میں آتی۔

۲۔ بعض ایسے واقعات بھی ہیں جس میں نو مولو دلڑکی کی ناف اس کے منہ میں بھر دی جاتی اور دَم گھٹنے کے باعث لڑکی کی موت واقع ہوتی۔

۳۔ راجپوتوں میں عام طریقہ تھا کہ ماں کی چھاتیوں پر دھتورا اور خشخاش کا لیپ کردیا جاتا۔ نو مولو دلڑکی کے پیٹ میں دودھ کے ساتھ یہ زہر بھی پہنچ جاتا۔

۴۔ ایک دوسرا طریقہ یہ بھی تھا کہ زمین میں ایک بڑا گڈھا کھودا جاتا اور اسے دودھ سے بھر دیا جاتا اور نومولود لڑکی کو اس گڈھے میں ڈبو دیا جاتا۔

۵۔ پنجاب میں نومولود لڑکی کو گڈھے میں دفن کر دیا جاتا یا پانی سے بھرے کسی برتن میں لڑکی کو ڈبو دیا جاتا۔ پنجاب میں ایک اور طریقہ بھی رائج تھا کہ نومولود لڑکی کے ہاتھ میں روئی رکھ دی جاتی اور منہ میں گڑ (براؤن شوگر) جیسا سفوف ڈال دیا جاتا اور جب لڑکی آہستہ آہستہ دم توڑنے لگتی تو یہ گیت گایا جاتا۔

گڑ کھائیں پونی کھا توں
آپ نہ آؤں بھیسا کھالیں
گڑ کھاؤ کپڑا گھماؤ
اپنی جگہ بھائی کو بھیجو

اطفال کشی کا آغاز شہنشاہ جہانگیر کے دور میں ہوا اور جہانگیر نے اس کی سختی سے مخالفت کی۔[1]

اعظم گڑھ کے مجسٹریٹ اور کلکٹر مسٹر تھامسن نے اس رسم کے خلاف مہم چلائی۔ جب سروے کیا گیا تو پتہ چلا کہ دس ہزار راجپوتوں میں ایک بھی لڑکی موجود نہیں تھی۔ اسی طرح بنارس کے باسٹھ دیہاتوں میں چھ برس کی ایک لڑکی بھی وہاں نہیں پائی گئی۔ [2]

بچپن کی شادی:

اس زمانے میں بچپن کی شادی کا بھی عام رواج تھا اکثر لڑکیوں کی شادی پانچ تا دس برس کی عمر میں کر دی جاتی تھی چونکہ لڑکیوں کو تعلیم نہیں دی جاتی تھی اس لئے ان کی شادی بہت کم عمری میں کر دی جاتی تھی وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح لڑکی باعصمت اور پاک

۱۔ Kaur Manmohan, Rule of Women in the freedom P: 9- (1968)

۲۔ Kaur Manmohan, Rule of Women in the freedom P: 11- (1968)

باز رہ سکتی ہے ایک خیال یہ بھی تھا کہ کم عمر لڑکی اپنے شوہر اور اس کے رشتے داروں کے ساتھ جلد گھل مل جاتی ہے۔ کم عمر لڑکیاں اس شادی میں اتنی ہی دلچسپی لیتی تھیں کہ انہیں کچھ مٹھائیاں کھانے کو مل جاتی تھیں اور کچھ نئے کپڑے اور آتشبازی کا کھیل دیکھنے کو ملتا تھا۔ اپنی عمر سے بہت بڑی عمر کے شوہر کے ساتھ وہ زندگی گذارنے پر مجبور تھیں۔ بعد میں وہ اپنے شوہر کے ظلم کا شکار بنتیں۔ ان شادیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ لڑکی پیدائش سے موت تک عجیب حالات کا شکار ہوتی تھی پہلے وہ کمسن بیوی پھر کمسن ماں اور کبھی کبھی کمسن بیوہ بن جاتی تھی اس رسم کی وجہ سے عورت کی جسمانی اور دماغی نشو ونما پر مضر اثر پڑتا تھا۔ وہ جوانی میں ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دب جاتی تھی۔ اس سے جو خرابیاں پیدا ہوئیں ان میں کم عمر بیوائیں، ابنارمل ڈیلیوری، اور لمبی بیماریاں شامل ہیں۔ بچپن کی شادی نے ماں اور بچے دونوں کے تناسب میں اضافہ کیا۔

بیوہ کی حالت:

بچپن کی شادی کی وجہ سے بہت سی لڑکیاں بالغ ہونے سے پہلے بیوہ ہو جاتی تھیں۔ اکثر بیوائیں اپنے شوہر کے ساتھ جل جاتی تھیں اس رسم کو بعد میں ''ستی کی رسم'' کا نام دیا گیا ابتداء میں شہزادوں کے مرنے کے بعد ان کی رانیاں چتا میں جل کر مر جاتی تھیں چونکہ اس زمانے میں کثرتِ ازدواج کا رواج تھا اس لئے ایک راجہ کے مرنے پر اس کی کئی بیوائیں جلنے پر مجبور ہو جاتیں۔ رفتہ رفتہ یہ رسم سماج میں اپنی جڑیں پھیلانے لگی۔ عام بیواؤں سے مطالبہ کیا جانے لگا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ستی ہو جائیں۔ اس رسم میں بیوہ کو بھنگ پلا دی جاتی تھی تا کہ وہ موت کا خوف بھول جائے۔ اکثر بیوائیں جلنا نہیں چاہتی تھیں لیکن زبردستی انہیں آگ میں ڈھکیل دیا جاتا تھا۔ جن فرقوں میں ستی کی رسم رائج نہ تھی ان میں بھی بیوہ کی حالت بہت خراب تھی اسے کم سے کم سہولت دی جاتی تھی وہ بنیادی ضرورتیں بدقت تمام پورا کر پاتی تھیں۔ دن بھر میں صرف ایک بار کھانا دیا جاتا تھا آرام دہ

بستر کی بجائے اسے فرش پر سونے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ وہ اچھے کپڑے نہیں استعمال کرسکتی تھی۔ اگر بیوہ بیس برس سے کم عمر کی ہوتی تو اسے ایک چھوٹے سے بارڈر کی ساڑھی پہننے کو دی جاتی تھی اگر اس کی عمر زیادہ ہوتی تو صرف سفید ساڑھی استعمال کرسکتی تھی۔ گھر کے کاموں کا سارا بوجھ اس پر ڈال دیا جاتا تھا۔ ایک اوسط درجے کے خاندان میں بیوہ کے ذمہ کھانا پکانا گھر کے برتن صاف کرنا مریضوں کی تیمارداری کرنا اور گھر کی نگہداشت کرنا تھا۔ [1]

بیوہ کو منحوس سمجھا جاتا تھا اور شادی بیاہ کے رسومات میں اسے شامل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ دلہن جب گھر میں پہلا قدم رکھتی تو اس گھر سے بیوہ کو دور رکھا جاتا۔ ۱۸۸۱ء میں بیواؤں کی تعداد کا اوسط ۱۸۷ فی ہزار تھا۔ سب سے زیادہ بیوائیں میسور میں تھیں ۲۵۱ فی ہزار [2]

کثرتِ ازدواج (Polygamy):

کثرتِ ازدواج کی وجہ سے بھی عورت کی سماجی حیثیت میں گراوٹ آئی۔ بنگال، اتر پردیش اور پنجاب میں اس کا رواج تھا۔ لڑکیوں کی شادی کم عمری میں کی جاتی تھی اس لئے ان پر شوہر اور ساس کا مکمل تسلّط ہوتا تھا۔ جب کبھی بیوی اپنی آزادی کے لئے یا ظلم کے خلاف کچھ کہتی تو اسے دوسری شادی کی دھمکی دی جاتی تھی۔ کثرتِ ازدواج کا رواج ہندوؤں میں بھی عام تھا اور بیویوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی تھی لیکن معاشی وجوہات کی بناء پر صرف اونچے طبقے میں اس کا رواج تھا۔ نچلے اور اوسط طبقے میں ایسی صورتوں میں دوسری شادی کی جاتی تھی جب عورت کو نرینہ اولاد نہ ہو یا بیوی لمبی بیماری کا شکار ہو یا دونوں خاندانوں میں جھگڑا ہو جائے۔ پنجاب میں بڑے بھائی کی موت پر اس کی بیوہ سے چھوٹے بھائی کا بیاہ کرنے کا رواج تھا۔ عورت کو خاندان کی ذاتی ملکیت سمجھا

---

[1] Mullik B, The Hindu Family in Bengal P. 117 (1882)

[2] Kaur Manmohan "Role of Women in the Freedom Movement P. 87

جاتا تھا۔ اس رسم کو پنجاب میں ''کریوا'' یا چادر اندازی کہا جاتا تھا۔ مسلمانوں میں بھی ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت ہے۔ لیکن ان کی تعداد کا تعین کر دیا گیا کہ ایک مسلمان بیک وقت چار بیویاں اپنے نکاح میں رکھ سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے کڑی شرطیں رکھی گئی ہیں۔ مغربی پنجاب میں دوسری شادی کو سخت معیوب سمجھا جاتا ہے اور ایک کہاوت مشہور تھی۔

''دو بیویوں کا شوہر ایسا ہی ہے جیسے ''کتوں کے درمیان سوّر''۔

پردے کا رواج:

عہد قدیم میں پردے کا رواج نہ تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ ہندوستان میں یہ رواج تقویت پاتا گیا۔ ابتداء میں غیر ملکی حملہ آوروں سے اپنی عورتوں کو بچانے کے لئے پردہ رواج پانے لگا۔ بچپن کی شادی بھی ایک وجہ ہے۔ لڑکیوں کی شادی بہت کم عمری میں ہو جاتی تھی اس لئے شوہر انہیں دوسروں سے محفوظ رکھنے کے لئے پردے کا حکم دیتا تھا۔ کمسن بیوی کو اس کے شوہر سے پردہ کروایا جاتا تھا چونکہ بیوی کمسن ہوتی اور اور شوہر بالغ اس لئے بھی یہ رسم رواج پانے لگی۔ مسلمانوں میں بھی پردے کا رواج عام تھا۔ مسلمان عورت کسی نامحرم کے سامنے نہیں آسکتی تھی وہ جب باہر نکلتی تو ایک چادر سے اپنا بدن ڈھانک لیتی تھی۔ ہندوؤں میں بھی غیر شادی شدہ لڑکی کو کھلے عام باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی عورتیں سر پہ آنچل اس طرح ڈھانک لیتی تھیں کہ چہرے کا بڑا حصّہ چھپ جاتا اپنے بزرگوں کی موجودگی میں شوہر کے سامنے بھی وہ چہرہ ڈھانک کر آتی۔ رفتہ رفتہ ''زنانہ'' کا رواج عام ہوتا گیا۔ ''زنانہ'' کا مطلب عورتوں کو ایک ایسی عمارت میں رکھا جاتا جس میں کھڑکیاں نہ ہوتیں روشن دان بہت اونچائی پر لگائے جاتے۔ سوائے پکوان کے وہ کسی اور کام میں حصہ نہ لے سکتی تھیں۔ راجپوت عورت اپنے گھر سے قدم باہر نہیں نکال سکتی تھی کہا جاتا ہے کہ اگر کسی راجپوت کا مکان جنگل میں ہے اور کنواں بالکل سامنے ہو تب بھی عورت ضرورتاً پانی لینے کے لئے گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکتی تھی۔ اس قید کی وجہ سے عورت کی صحت اس کے

احساس اور شعور و قدرتی صلاحیتوں پر برا اثر پڑا۔ پنجاب میں بھی پردہ عام تھا ایک قول مشہور تھا ''اندر بیٹھی لاکھ دی باہر گئی خاک دی۔''

''دیوداسیاں'':

اس رسم نے بھی عورت کی اہمیت کو گھٹا دیا۔ عورتوں کو دیوداسی بنا کر مندروں میں چھوڑ دیا جاتا تھا۔ مہاراشٹرا میں انہیں ''کھنڈابا'' اور پونا میں ''مرلی'' کہا جاتا تھا۔
مندروں میں دیوتاؤں کو خوش کرنے کے بہانے پنڈتوں نے کئی ریاکاریاں کو اپنایا تھا۔ دیوداسیاں بھگوان کے نام پر چھوڑ دی جاتی تھیں وہ اپنے گیتوں اور ناچ کے ذریعے بھگوان کو خوش کرتیں۔ ان میں اکثر ایسی بیوائیں بھی شامل ہوتی تھیں جو تیرتھ استھانوں پر مذہبی فرائض کی ادائیگی کے لئے جاتی تھیں اور پنڈتوں کے ہوس کا شکار بن جاتی تھیں۔ مدارس میں انہیں دیوداسیاں اور بنگال میں ویشنوی کہا جاتا ہے۔ ۱۹۰۰ء میں گیارہ ہزار پانسو تہتر (۱۱،۵۷۳) دیوداسیاں مدارس میں پائی گئیں اور یہ لڑکیاں پنڈتوں کی مشترکہ ملکیت سمجھی جاتی تھیں[1]۔
ان لڑکیوں کو بچپن ہی میں بھگوان کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا ان کے ذمے مندر کی خدمت کرنا تھا۔ مندر کے چراغ جلانا فرش صاف کرنا اور مندر آنے والوں کا استقبال کرنا ان کے فرائض میں شامل تھا۔ مہاراشٹرا میں کئی لڑکیاں بن بیاہی رہ کر مندروں کی بھینٹ چڑھ جاتی تھیں ان لڑکیوں کو دولت مند افراد کی خدمت میں ناچنے والیوں کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا۔ ان لڑکیوں کو فروخت کرنے کا رواج بھی عام تھا۔ معمولی سی رقم پر ان لڑکیوں کو فروخت کیا جاتا تھا ان لڑکیوں کی حالت بھیڑ بکریوں سے بدتر تھی۔

تعلیم کا مسئلہ:

عورتوں کو تعلیم دلانا سخت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ متوسط اور نچلے طبقے میں تعلیم

---

[1] Fuller M. "The Wrongs of Indian Women Hood" - P. 101 (1900)

حاصل نہ کرنے کی کئی وجوہات تھیں۔ پہلا سبب مالی دشواری، دوسرا بچپن کی شادی اور تیسرا سبب پردے کی رسم جس کی وجہ سے عورت غلامی کی زنجیر میں جکڑی ہوئی تھی۔ انگریزی تعلیم کا حصول انتہائی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ عورتیں جہالت کے اندھیرے میں تھیں۔

دورِ وسطیٰ میں عورتوں نے نمایاں کام انجام دیے۔ بہت سی عورتیں ایسی تھیں جنھوں نے علوم وفنون میں مہارت حاصل کی۔ بابر کی لڑکی نے ''ہمایوں نامہ'' لکھا۔ گوالیار کے راجہ مان سنگھ کی بیوی مرگ نینا (١٥١٥۔١٦٨٦) موسیقی کی ماہر تھیں۔ پندرہویں صدی میں روپاوتی اور اس کے بعد میرابائی نے گیتوں کو حیاتِ جاوید بخشی۔ رانی پدمنی، رضیہ سلطان، درگاوتی، چاند بی بی وغیرہ انتظامی صلاحیتوں کے لئے یاد رکھی جائیں گی ان کے علاوہ نور جہاں، جہاں آرا اور زیب النساء نے کافی شہرت پائی۔ گنگا دیوی نے وردان بیکا پرنایا (Varandan Bika Parnaya) نامی کتاب لکھی۔ تارابائی، پیشوا کے زمانے کی وہلکر وغیرہ نے نمایاں کام انجام دیے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد بے شمار تبدیلیاں عمل میں آئیں۔

اٹھارہویں صدی کے یورپ نے فرانس کا انقلاب دیکھا مختلف سطحوں پر نظریاتی تبدیلیاں آئیں۔ اس صنعتی انقلاب نے عورت کی حیثیت میں بھی تبدیلی کی۔ سائنسی ترقی نے بڑی حد تک جنسی ضد کو کم کیا۔ عورت کی آزادی کے لئے کئی تنظیمیں بنیں۔

Mary Wohnstore Craft انگلینڈ کی پہلی خاتون ہیں جنھوں نے عورت کی مساوات کے لئے آواز اٹھائی۔ انھوں نے اپنی ایک اہم تصنیف "A Vindication of The Nights of Women" میں اس وقت کے رسم ورواج اور قوانین جنھوں نے عورت کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا ان کے خلاف آواز اٹھائی۔ یورپ کی اس بیداری کا اثر ہندوستان پر بھی ہوا۔

☆☆

دوسرا باب

ہندوستان میں تحریکِ آزادئ نسواں

نسائی حسیت اور تحریک نسواں میں خلطِ مبحث کے امکانات بہت ہیں۔ تحریکِ نسواں میں ناگزیر طور پر نسائی حسیت کا وجود نہ تھا۔ دراصل تمام اصلاحی تحریکات میں جو سرپرستانہ رویہ اختیار کیا جاتا ہے وہ صنفی حسیت کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔ مختصراً ہندوستان میں تحریک آزادئ نسواں یا اصلاح نسواں کی تحریکات کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں بہت سی اصلاحی تحریکوں نے جنم لیا۔ عورتوں کی آزادی اور مساوات کی با قاعدہ تحریک ۱۹۴۸ء میں بی انتھونی نے شروع کی۔ انتھونی کا کہنا تھا کہ عورتیں ملک کی تعمیر میں مردوں کے برابر حصہ لے کر ایک مضبوط اور خوشحال ملک کی تشکیل کر سکتی ہیں۔ ہندوستان میں بھی دوسرے ممالک کے زیر اثرِ بیداری پیدا ہونے لگی لیکن صدیوں کی جمی ہوئی گرد کو ایک پھونک سے اڑا دینا ممکن نہ تھا۔ راجہ رام موہن رائے نے ہندوؤں میں اصلاحی تحریک چلائی انہوں نے ستی کی رسم کے خلاف آواز اٹھائی ۱۸۲۹ء میں لارڈ ولیم بینٹنگ کے دور میں اس رسم کو جرم قرار دیا گیا۔ راجہ رام موہن رائے نے برہمو سماج کی بنیاد ڈالی اور بیوہ کی دوسری شادی پر زور دیا۔ مہادیو گوندرانا

ڈے نے اس بات پر زور دیا کہ بارہ برس سے کم عمر کی لڑکی کی شادی نہ کی جائے اور جنسی تعلقات سولہ برس سے کم عمر کی لڑکی سے قائم نہ کیے جائیں۔ انہوں نے منو پر سخت تنقید کی۔ کیشب چندر سین نے بھی بچپن کی شادی کے خلاف سخت جدو جہد کی انہوں نے اپنی کوششوں سے ایک بل پاس کروایا جس میں لڑکی کی شادی کی کم سے کم عمر چودہ برس قرار پائی۔ اس بل میں کثرت ازدواج کو بھی جرم قرار دیا گیا بیواؤں کی دوسری شادی اور بین طبقاتی و بین فرقہ جاتی شادی کو جائز قرار دیا گیا۔ جن دنوں راجہ رام موہن رائے ستی کی رسم کے خلاف بنگال میں جدو جہد کر رہے تھے کرسچن مشینری نے ۱۸۲۴ء میں بمبئی میں لڑکیوں کا پہلا اسکول قائم کیا۔ ایشور چند اور ودیا ساگر نے ۱۸۴۹ء میں کلکتہ میں لڑکیوں کا ایک اسکول قائم کیا۔ ایشور چند اور ودیا ساگر نے ۱۸۴۹ء میں کلکتہ میں لڑکیوں کا ایک اسکول قائم کیا۔ ان کے علاوہ دیا نند سرسوتی نے بنگال میں، رانا ڈے نے مہاراشٹر میں عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں اہم رول کیا۔

بیسویں صدی کی ابتداء میں سرسید نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقد کی۔ جس کے بانی عبداللہ صاحب تھے۔ اس کانفرنس میں عورتوں کی آزادی اور تعلیم کے سلسلے میں بہت سے فیصلے کئے گئے۔ اس زمانے میں عطیہ فیضی آبرو بیگم، مسز رضا اللہ، اعلیٰ بی، سعید احمد بیگم اور سلطان جہاں بیگم فرماں روائے بھوپال جیسی ترقی یافتہ اور روشن خیال خواتین موجود تھیں تعلیم نسواں کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے ''خاتون'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد علی گڑھ میں عبداللہ صاحب نے باقاعدہ اسکول قائم کیا جو ویمنس کالج کی شکل میں آج بھی موجود ہے۔

تحریک نسواں کی اس جدوجہد میں مذہبی اور اصلاحی تحریکوں نے نمایاں حصہ لیا۔ مولوی چراغ علی نے ''تہذیب الاخلاق'' میں عورتوں کی حالت پر کئی مضامین لکھے مذہب کی روشنی میں عورت کی آزادی کے حدود متعین کئے اور عقل کی روشنی میں مذہبی احکام کو پرکھا۔ ممتاز علی، محبّ حسین وغیرہ نے بھی تہذیب نسواں، معلم نسواں جیسے رسالے جاری

کیے۔ عصمت، انیس نسواں، پیام نسواں اور ایسے کئی رسالے جاری ہوئے۔ بے شمار مضامین لکھے گئے جس میں یہ وضاحت کی گئی کہ ''اسلام میں عورت کی حالت ایسی پست ہرگز نہیں ہے جیسی کی ہندوستان کی مسلمان عورتوں کی ہے۔ اسلام نے عورت پر کوئی ایسی پابندی عاید نہیں کی ہے جس کی وجہ سے اس کے لئے دنیا تنگ ہو جائے'' [1]

''عورتوں کی تعلیم، سماجی آزادی، اقتصادی آزادی تمام باتوں کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ وہ اپنے آپ کو کمزور سمجھنا چھوڑ دے، مردوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا ترک کردے اور اپنے پیروں پر کھڑی ہو کر یہ بتادے کہ غلام ہندوستان کی غلام عورتیں اپنے حق کی بھیک نہیں مانگ رہی ہیں بلکہ حق کو حق سمجھ کر مانگتی ہیں اور حاصل کر کے دم لیں گی'' [2]

اس طرح پردے کو جو اسلامی پردہ سمجھا جاتا تھا اس کی وضاحت مختلف رسائل میں کی گئی: محبّ حسین لکھتے ہیں:

> شرعی پردہ تو صرف ساتر لباس کا پہننا اور اپنی زینتوں کو چھپانا ہے اور موجودہ پردہ یہ ہے کہ نہ عورت کو کوئی دیکھے اور نہ عورت کسی چیز کو دیکھے۔ شرعی پردے کے ساتھ عورتیں دنیا کے تمام کاروبار کر سکتی ہیں اور موجودہ پردہ میں وہ کسی کام کے لائق نہیں رہتی .... اگر پردے سے خدا کا مقصد یہ ہے کہ عورتیں گھروں میں بند رکھی جائیں اور باہر نہ نکلیں تو اس سے نعوذ باللہ حکم ربانی ہی بے معنیٰ ثابت ہوگا کیوں کہ جب عورتیں مردوں سے قطعاً علیحدہ رہیں گی اور مرد عورت باہم نہ ملیں گے تو پھر نیچی نظر رکھنے سے کیا فائدہ ہوگا'' [3]

---

[1] سید ضمیر الدین۔ مسلمان عورت عصمت دہلی ص ۱۳۱ (۱۹۳۹)

[2] مس سلطانہ منہاج ''لڑکیوں کی پہلی کانفرنس'' پیام نسواں اپریل ۱۹۴۰ ص۔ ۱۴

[3] محبّ حسین۔ ''موجودہ پردہ شرعی نہیں''۔ معلم نسواں جلد۔ ۸۔ ۱۳۲۲ء ص۔ ۳۳۔ ۳۴

اس طرح مسلمان عورتوں میں بیداری کی لہر دوڑ گئی۔ ادھر آریا سماج اور برہمو سماج نے عورتوں کی ترقی کی نئی راہیں کھول دیں لڑکیوں نے اسکول جانا شروع کر دیا۔ مسز جوشی وہ پہلی عورت ہیں جو ۱۸۸۸ء میں میڈیسن کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ملک سے باہر گئیں۔ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس تشکیل دی گئی۔ ہندوستانی عورت کو ایک سیاسی پلیٹ فارم فراہم ہوا۔ سورنا کماری اور جے گنگولی نے ۱۹۰۰ء میں کلکتہ میں ہونے والے کانگریس سیشن میں شرکت کی۔ شریمتی گنگولی وہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے کانگریس کے پلیٹ فارم سے تقریر کی۔ یہاں سے عورتوں کی آزادی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کے پہلے دہے میں سیاسی افق پر عورتوں نے نمایاں ترقی کی۔ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۱۸ء کے درمیان ہوم رول کی تحریک چلی مسز اینی بسینٹ نے تمام ہندوستانیوں سے اپیل کی کہ اگر وہ اپنی اور اپنے ملک کی نجات اور بہبودی چاہتے ہوں تو انہیں عورتوں کی حالت بدلنی چاہیے۔ انگریزی راج کے خلاف مسز اینی بسینٹ نے جدو جہد کی جس کے نتیجے میں انہیں جیل بھی جانا پڑا جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ کانگریس کی صدر منتخب ہوئیں۔ ہندوستان میں آزادی کی لڑائی نے وقتی طور پر عورتوں اور مردوں کو یکجا کر دیا اس تحریک میں بہت سے خواتین مثلاً اینی بسینٹ سروجنی نائیڈو، کستوربا گاندھی، مسز وجے لکشمی پنڈت وغیرہ پیش پیش تھیں۔

آزادی اور سیاسی اصلاحات کے لئے یہ ضروری تھا کہ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی حق رائے دہی دیا جائے۔ ۱۸۸۴ء میں اس کا مطالبہ کیا گیا اور ۱۹۰۶ء سے اس کی جدو جہد شروع کی گئی۔ مسز اینی بسینٹ ۔ نے تمام ہندوستانیوں سے اپیل کی کہ اگر وہ اپنی اور اپنے ملک کی نجات اور بہبودی چاہتے ہوں تو انہیں عورتوں کی حالت بدلنی چاہیے۔ انگریزی راج کے خلاف مسز اینی بسینٹ نے جدو جہد کی جس کے نتیجے میں انہیں جیل بھی جانا پڑا جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ کانگریس کی صدر منتخب ہوئیں۔ ہندوستان میں آزادی کی لڑائی نے وقتی طور پر عورتوں اور مردوں کو یکجا کر دیا اس تحریک میں بہت سی خواتین مثلاً

اینی بسینٹ سروجنی نائیڈو، کستور با گاندھی، مسز وجے لکشمی پنڈت وغیرہ پیش پیش تھیں۔

آزادی اور سیاسی اصلاحات کے لئے یہ ضروری تھا کہ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی حق رائے دہی دیا جائے۔ ۱۸۸۴ء میں اس کا مطالبہ کیا گیا اور ۱۹۰۶ء سے اس کی جدوجہد شروع کی گئی۔ مسز اینی بسینٹ۔ مارگریٹ کازنس (Margret Causins) اور ڈورتھی Jeena Raja Dasa Dorthi نے اس تحریک میں بھرپور حصّہ لیا۔ ہندوستانی خواتین کا ایک وفد سروجنی نائیڈو کی قیادت میں مملکت کے سکریٹری مسٹر مانٹگو (Mr. Mantago) سے ۱۹۱۹ء میں ملا اس جدوجہد کا اختتام ۱۹۲۶ء میں ہوا پہلی بار ہندوستانی عورتوں نے ووٹ دینے کا حق حاصل کیا۔ جنسی تفریق کی بنیاد پر حق رائے دہی سے محروم کرنے کا قانون ۱۹۲۷ء میں مدارس، بمبئی، پنجاب، وسطی علاقے اور آسام سے ہٹا لیا گیا۔ ۱۹۳۵ء میں یہ ایکٹ بنایا گیا ایسی تمام خواتین جن کی عمر اکیس برس سے زیادہ ہو انھیں ووٹ دینے کی اہل قرار دیا گیا۔

ہندوستانی عورت جو چار دیواری کے اندر قید رہا کرتی تھی جس کی دنیا اپنے گھر تک محدود تھی اس نے جدوجہد آزادی میں حصہ لینے کے لئے صدیوں پرانی نقاب اتار کر پہلی بار انتخابات میں حصہ لینے لگی۔ وجے لکشمی پنڈت پہلی خاتون وزیر بنیں۔ انوسویا بائی کالے اور سی۔ پی۔ ملانی وسطی علاقے اور سندھ اسمبلی میں بالترتیب ڈپٹی اسپیکر بنیں۔

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں خواتین نے حصہ ضرور لیا تھا۔ لیکن تمام تحریکات میں وہ کھل کر حصہ نہیں لے سکتی تھیں کیوں کہ ابھی جھجھک باقی تھی لیکن مہاتما گاندھی نے پہلی بار کچھ منتخب خواتین کو نمک ستیہ گرہ میں حصّہ لینے کی اجازت دی۔ یہ ستیہ گرہ اپریل ۱۹۳۰ء کی صبح شروع ہوئی نمک ستیہ گرہ کا دن ایک جدوجہدِ آزادی کا اہم دن تھا دوسری طرف خواتین کی آزادی کا بھی ایک تاریخی دن بن گیا۔ اس سینکڑوں ہزاروں خواتین ساحلِ سمندر پر بڑی بہادری سے کھڑی تھیں ان عورتوں کے ہاتھوں میں ہتیار نہیں بلکہ مٹی کے ڈھیلے تھے۔ اس دن ان خواتین کو سب نے بڑی حیرت سے دیکھا کہ کس طرح ہندوستانی عورتوں نے

پرانی روایت کو توڑ کر ملک کی آزادی اور سماجی ترقی کی جنگ میں عملاً حصہ لیا۔ کملا دیوی چٹوپا دھیائے نے اپنے مضمون ''آزادی کی جدوجہد'' میں لکھا: ''ہم نے نمک کا قانون توڑ دیا اور اب ہم آزاد ہیں کون ہم سے آزادی کا نمک خریدے گا کیا تم آزادی کا نمک نہیں چاہتے ہو؟'' ۱؎

ان الفاظ میں خواتین جدوجہد کا اعلان کر رہی تھیں۔ اس تحریک کی کامیابی میں عورتوں نے نمایاں حصہ لیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر اس جدوجہد میں عورتیں شریک نہ ہوتیں تو اس تحریک کو ایسی کامیابی نہ ملتی۔ ۱۹۳۱ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس کراچی میں ہوا وہاں یہ اعلان کیا گیا کہ جنس کے اختلاف پر کوئی تخصیص نہیں برتی جائے گی۔ عورتوں کی جدوجہدِ آزادی اور ہندوستانی کی جدوجہد آزادی شیر و شکر کی طرح گھلے ہوئے ہیں۔ آزادی کی تحریک جس کی رہنمائی گاندھی جی نے کی دھیرے دھیرے خواتین روایتی پابندیوں سے نکل آئیں۔ ابتداء میں تمام ممتاز لیڈروں کی رشتہ دار عورتیں شامل ہوئیں جیسے کستور با گاندھی، کملا نہرو، بی اماں (علی برادران کی ماں) وجے لکشمی پنڈت، سروجنی نائیڈو اور کملا دیوی وغیرہ نے قومی تحریک میں حصہ لیا دھیرے دھیرے دوسری عورتیں بھی اس جدوجہد میں شامل ہو گئیں۔ ہندوستانی خواتین کے اس جذبے سے متاثر ہو کر ۱۹۳۲ء میں مہاتما گاندھی نے پیرس اور سوئٹزرلینڈ میں بڑے فخر سے یہ بات کہی تھی ''میں یورپ کی خواتین کو یہ پیغام دے رہا ہوں کہ انہیں ہندوستانی عورتوں کی پیروی کرنی چاہیے جو پچھلے برس ایک دم عوامی تحریک کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مجھے یقینِ کامل ہے کہ اگر یورپ کی عورتیں عدم تشدّد سے سبق سیکھیں تو انہیں سکون اور اطمینان حاصل ہو سکتا ہے ۲؎

۱۹۲۶ء میں خواتین کو ووٹ دینے کا حق تو مل گیا تھا لیکن انہیں ودھان سبھا کا ممبر بننے کا حق نہیں تھا صرف انہیں خواتین کو ووٹ دینے کا حق تھا جو ٹیکس ادا کرتی تھیں۔ ۱۹۳۵ء میں بعض سیاسی اصطلاحات کی گئیں جن سے عورتوں کے حقوق میں اضافہ ہوا۔ ۱۹۳۶ء

۱؎ Kamala Devi Chalupdhyae "Women of India" P. 20

۲؎ Kaur Amrita - Women and Social Injustice Foreward- M.K. Gandhi.

میں بہت سی خواتین اسمبلی ممبر منتخب ہوئیں۔

۱۹۳۷ء میں Hindu Women's Right to Property Act پاس ہوا۔ اس ایکٹ کے ذریعہ عورت کو شوہر کی جائیداد میں حصہ دینا ضروری قرار دیا گیا۔ مہاتما گاندھی نے اپنی تقریروں میں اس بات پر زور دیا کہ عورت اور مرد کو ساتھیوں کی طرح رہنا چاہیے۔

تعلیم نسواں کی تحریک بنگال سے شروع ہوئی تھی۔ یہاں کی خواتین نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ادبی حلقوں میں شہرت حاصل کی۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی بہن سورن کماری دیوی بنگال کی پہلی خاتون ناول نگار ہیں آشالتا، آشا پورن دیوی اور لیلیٰ مجمدار نے بنگالی ادب میں کافی اہمیت حاصل کی۔ ہندی میں ہیم وتی دیوی، اوشا دیوی اور مہا دیوی ورما کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔ اردو میں نذر سجاد حیدر حجاب امتیاز علی، ڈاکٹر رشید جہاں اور عصمت چغتائی کے نام اہم ہیں۔ کشمیری زبان میں حبہ خاتون، گجراتی میں لھو بند مہتا تیلگو میں وسواندرم، پدماوتی دیوی، تامل میں کوٹھیا منا گی، آسامی میں سنہیہ لتا انگریزی میں سروجنی نائیڈو بھارتی سارہ بھائی وغیرہ اہم خواتین ادیب وشاعرہ ہیں۔ دھیرے دھیرے عورت ہر شعبہ زندگی میں نظر آنے لگی۔ ہندوستان میں کوئی پیشہ اور شعبہ ایسا نہیں ہے جہاں اختلافِ جنس کی بنا پر خواتین کو موقع دینے سے انکار کیا جاتا ہو۔ آزادی کے بعد ایک خاتون مسز اندرا گاندھی وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ حاصل کیا۔ اس کے باوجود سماج میں بعض پیشے خواتین سے مخصوص کر دیے گئے ہیں جیسے پرائمری اسکول کی ٹیچنگ، سکریٹری، ٹیلیفون آپریٹر، اسٹنو گرافر نرسنگ، بک کیپنگ، ریسپشنسٹ وغیرہ ایسے ہی پیشے ہیں۔ آزاد ہندوستان میں ہر اعتبار سے مردوں کے برابر قانونی حقوق دے کر ہندوستان میں خواتین کی سماجی و اقتصادی بنیادوں کو مضبوط بنا دیا ہے۔

☆☆

تیسرا باب

نسائی تحریک کے مختلف رجحانات

سولھویں صدی عیسوی تک عورت مکمل طور پر مرد کے اختیار میں رہی۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سماجی زندگی میں عورتیں صدیوں سے اپنی حیثیت پر بغیر کسی شکوہ کے صابر و شاکر رہی ہیں۔ سترہویں صدی میں بعض خواتین نے اپنے فرقے کی آزادی کے لئے جدو جہد شروع کی۔ ابتدا میں اس احتجاج کی مردوں نے پرواہ نہیں کی اس بے پرواہی سے عورتوں میں مخالفت کا جذبہ اور بھی بڑھ گیا۔ کیوں کہ اس کے بعد ہی عورتوں نے مردوں کے استبداد اور ظلم کے خلاف کھلم کھلا اعتراضات کرنا شروع کر دیا اپنے نظریے کی وضاحت کی کہ مرد اور عورت اپنے حقوق کے اعتبار سے برابر ہیں۔ نسائی تحریک کا آغاز مغربی ممالک میں ہوا۔ اپنی حیثیت سے بے اطمینانی عورت نے فرانس کے صنعتی انقلاب کے ابتدائی زمانے میں کی۔ صنعتی انقلاب نے عورت سے اس کی ملازمت چھین لی زرعی کاموں میں زیادہ تر مرد مزدوروں کو نوکری دی گئی۔ کارخانے قائم ہوئے۔ بنی بنائی چیزوں کی مانگ بڑھنے لگی۔ مرد دولت مند ہوتے گئے اپنی دولت کی نمائش کے لئے انہیں ایک چیز کی تلاش ہوئی جس کو سجا کر رکھا جائے۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا۔ مسلسل بے کاری

سے اکتا کر اور گڑیا جیسی زندگی سے بیزار ہو کر عورتوں نے نسائی تحریک شروع کی۔

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم نے نسائی تحریک کو بڑھاوا دیا۔ یورپ کے مردوں کی اکثریت کو جنگ میں جھونک دیا گیا ملک کی اندرونی خدمات مجبوراً عورتوں کو انجام دینی پڑیں۔ عورت کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں مردوں کی جگہ کام کر سکتی ہیں۔ عورتوں نے جان لیا کہ مردوں کی برتری بالکل حقیقت سے بعید ہے مرد نے عورت کو محکوم رکھنے کے لئے یہ بات تراشی تھی کہ مردوں کا کام قوت سے انجام پا سکتا ہے جو عورت کے بس کا نہیں۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اب وہ وقت آپہنچا کہ عورت اپنا حصہ طلب کرے۔ تحریک نسواں ترقی کرتی گئی۔ نسائی تحریک یا Feminism ایک رجحان ایک انداز فکر اور ایک فلسفے کا نام ہے۔ جیسے جیسے نسائی تحریک ترقی کرتی گئی اس کے مختلف دبستان بنتے گئے۔ چند اہم دبستان حسب ذیل ہیں:

۱۔ معتدل یا حقوق نسواں کی تحریک (Moderate or Women's Rights Feminism)

۲۔ انتہا پسند نسائی تحریک Redical Feminism

۳۔ اشتراکی نسائی تحریک Socialist Feminism

معتدل یا حقوق نسواں کی تحریک:

اس دبستان کا خیال ہے کہ نفسیاتی اور سماجی عوامل نے عورت کے درجے کو کمتر بنا دیا ہے۔ جان اسٹورٹ مل John Staurt Mill جو اس تحریک کا زبردست حامی تھا اس کی تصنیف Subjection of Women (1861) نسائی تحریک کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ میل کا کہنا ہے کہ عورت کی اس حیثیت کی وجہ صدیوں پرانے فرسودہ سماجی اصول ہیں۔ اس کا پتہ نہیں چلتا کہ کب عورت کم تر درجے پر فائز ہوئی۔ اس کی ایک وجہ جسمانی طور پر عورت کی کمزوری سمجھی جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ کمزوری قانونی حیثیت اختیار کرتی

گئی۔ مِل کا کہنا ہے کہ جسمانی اور دماغی اعتبار سے عورت کمزور نہیں ہوتی یہ محض مفروضہ ہے کہ عورت کمزور ہے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ عورت کی ''نسائیت'' کو جگانا ضروری ہے تب ہی عورت اپنا وقار بلند کر سکتی ہے۔ وہ کہتا ہے عورت کا کام صرف مرد کے جسمانی تقاضوں کو پورا کرنا نہیں ہے بلکہ وہ خود بھی اپنے طور پر آزادانہ زندگی بسر کر سکتی ہے۔ عورت بھی ایک انسان ہے اس لئے اپنی مرضی کے مطابق پسند یا ناپسند رکھنے کا اسے بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ مرد کو۔۔مِل کا خیال ہے کہ مرد اور عورت مختلف صلاحیتیں رکھتے ہیں یہ صلاحیتیں برتر یا کم تر نہیں ہوتیں بلکہ ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔ مِل کہتا ہے عورت اور مرد ایک دوسرے کے ساتھ مل کر طاقتور ہو جاتے ہیں برخلاف اس کے کہ وہ علیحدہ رہیں۔ لیکن وہ عورت کے چند کام مخصوص کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے عورت کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ زندگی کو خوبصورت بنائے یہ خوبصورتی اس کے اپنے وجود میں ہو اور ان کے لئے بھی جو اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ عورت دماغ روح اور جسم کو خوبصورت بنائے۔ دوسرے ہم خیال دانشوروں کی طرح مِل بھی چاہتا تھا کہ عورت کے حقوق کو قانونی موقف حاصل ہو۔ مِل نے عورت کے حقوق کے لئے مسلسل جدوجہد کی۔

مرنے کے بعد اس نے چھ ہزار پاونڈ جو اس کی منجملہ جائیداد کا نصف تھے عورتوں کی تعلیم کے لئے وقف کر دیے۔ [1]

دوسرے مغربی دانشور نے تقریباً وہی خیالات ظاہر کئے جو مِل نے پیش کئے۔ البتہ رسّل Bertrazal Russel عیسائی مذہب کو عورت کی حیثیت کو کمتر بنانے کی ساری ذمہ داری عیسائی مذہب پر ڈالتا ہے۔ وہ جنسی تفریق کے خلاف سخت احتجاج کرتا ہے۔

مہاتما گاندھی بھی عورت کے مسائل کے سلسلے میں قریب یہی خیالات رکھتے تھے انہوں نے شوہر کے اپنی بیوی کو غلام سمجھنے کے رویّے پر سخت تنقید کی۔ وہ عورت اور مرد کو سماجی

---

1. Carr, Wendell R. Introduction in Mill, John Stuart, The Subjection of Women- 1970 P. XI

حیثیت سے برابر سمجھتے تھے۔ جولوگ عورتوں کی تعلیم کے خلاف تھے گاندھی جی نے ان کی مخالفت کی۔ گاندھی جی عورت کا بنیادی فریضہ ماں بننا اور گھر کی دیکھ بھال کرنا سمجھتے تھے۔ وہ بھی مرد اور عورت کے علیحدہ علیحدہ خصوصیات کے حامی تھے۔ وہ کہتے تھے کہ مرد اور عورت کے فرائض مختلف ہونا چاہیے۔ ایک 'ماں' میں جو صلاحیت ہوتی ہے مرد اس سے محروم ہے۔ مرد روٹی کمائے اور عورت اس کی تقسیم کرے۔ عورت کا کام بچوں کی تربیت اور ان کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ عورت کو ''چراغ خانہ'' ہونا چاہیے۔ گاندھی جی کا ایقان تھا کہ قدرت نے عورت کو جو فرائض سونپے ہیں اسے ان کی تکمیل کرنی چاہیے۔ مِل کی طرح وہ بھی عورت کے عوامی زندگی میں گھل مل جانے کے سخت مخالف تھے۔

اس تحریک کے بعض حامی جیسے بیٹی فرائڈ مین Betty Friedmen جو جنگ عظیم کے بعد معتدل نسائی تحریک کے بانیوں میں تھا۔ اس نے اس خیال کو پیش کیا کہ ''عورت کو زندگی کے چیلنج کا سامنا نہیں کرنا چاہیے بلکہ وہ بطور بیوی اور ماں اپنی خودداری اور عزتِ نفس کا پاس کرنا چاہیے۔ جو قوت ایسا نہیں کرتیں وہ زندگی کی مسرتوں کو حاصل نہیں کرسکتیں اور خود کو قصوروار ٹھہراتی ہیں نہ کہ حالات کو۔'' [1]

وہ اس کا حل تعلیم نسواں اور اپنی مرضی سے خواتین کو پیشہ منتخب کرنے کی آزادی دینا سمجھتا ہے۔ فرائیڈ مین کہتا ہے ''یہ سخت رویہ اس وقت تک قائم رہے گا جبکہ تک عورت مساویانہ انسانی حقوق حاصل نہیں کرے گی [2]

مِل، رَسل، گاندھی جی، فرائیڈ مین اور دوسرے دانشور جو اس مکتب خیال کے حامی ہیں وہ عورت کی گھریلو حیثیت میں کسی تبدیلی کے خواہاں نہیں ہیں۔ بچوں کی نگہداشت، گھر کی دیکھ بھال عورت کی جسمانی ساخت اور ذہنی سطح کے اعتبار سے بے حد مناسب سمجھتے ہیں اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ عورت کو جسمانی طور پر جو کمزور سمجھا جاتا ہے

---

[1] Shah Kalpana- women's liberation & voluntry action - 1984 - P: 11

[2] " " " " " " "

اس کی یہ لوگ مخالفت نہیں کرتے۔ وہ عورت کی حیثیت کو اونچا تو کرنا چاہتے ہیں لیکن مخصوص حدود میں رہ کے۔ اگر کسی سے کہا کہ جائے کہ فلاں فرد کی عزت کرو تو اس سے وہ عزت نہیں کرنے لگتا۔ چھوت چھات کو برا سمجھنے سے ہریجن کا رتبہ سماج میں بلند نہیں ہو جاتا کیوں جن پیشوں سے وہ وابستہ ہیں اس کی سماج میں کوئی اہمیت نہیں۔ اس طرح عورت کی حیثیت بھی اس کے تفویض کردہ فرائض اور کاموں سے پہنچائی جائے گی۔ موجودہ سماج میں عورت گھریلو ذمہ داریاں بلا معاوضہ پورا کرتی ہے اگر ان ذمہ داریوں کو پیشہ تصور کیا جائے تو اس کی اجرت کم تر ہوگی پھر کس طرح عورت مساویانہ درجہ حاصل کر سکتی ہے، اگر یہ کام قابلِ توقیر ہے تو مرد کیوں انجام نہیں دیتے؟ ایسے کئی سوالات ہیں جن کا جواب معتدل نسائی تحریک والوں کے پاس نہیں ہے۔

مصر کے دانشور فرید وجدی آفندی بھی اس خیال کے حامی ہیں کہ عورت کو قدرت نے دنیا میں جس غرض سے مخلوق کیا ہے وہ غرض نوعِ انسان کی تکثیر اور اس کی حفاظت و تربیت ہے پس اس حیثیت سے اس کا قدرتی فرض ہے کہ اس اہم فرض کی انجام دہی کے لئے ہمیشہ کوشش کرتی رہی اس فرض کی انجام دہی کے لئے جن اعضاء اور اعضا میں تناسب کی ضرورت تھی قدرت نے اسے عطا کیا۔ وہ لکھتے ہیں ''حقیقت یہ ہے کہ قدرت نے دنیا کے کاموں کے خود ہی دو حصّے کر دیے ہیں نوعِ انسانی کی حفاظت اور تکثیر! اور انسانی ضروریات کا انتظام۔ پہلا کام عورت کے ذمہ قرار دیا گیا اس لئے اس کو اسی قسم کے اعضا دیے گئے اسی قسم کی جسمانی قوت مل گئی ہے جو اس فرائض کی انجام دہی کے لئے ضروری ہیں۔ دوسرا کام مرد سے متعلق کیا گیا ہے۔ اس لئے اسی کے مطابق جسمانی و دماغی طاقت عطا کی گئی۔ ان دونوں گروہوں کا الگ الگ کام دنیا کا مجموعی تمدن قائم رکھنا ہے اور جب اختلاف اٹھانے کی کوشش کی گئی یا کوئی گروہ اپنے فرائض سے باہر قدم نکالتا ہے تو تمدن اور معاشرت کے انتظام میں خلل پڑ کر سینکڑوں دقتیں اور مشکلیں پیدا ہو جاتی ہیں''[1]

---

[1] المراۃ المسلمہ۔ (مسلمان عورت مترجم ابوالکلام آزاد) فرید وجدی آفندی۔ ص ۲۵ مکتبہ اشاعت القران دلی

موجوددور میں بھی اس رجحان کے حامی کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

انتہاپسند نسائی تحریک:

انتہا پسند نسائی تحریک کے حامی معتدل نسائی تحریک اور مارکسٹ نظریات کے مخالف نظر آتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ سماج کو جنسی بنیاد پر تقسیم کیا گیا ہے نا کہ طبقاتی بنیاد پر۔ بنیادی مسئلہ مرد کا فوقیت جتانا ہے۔راشزم Racism، کیپٹلزم، امپریلزم وغیرہ مرد کی فوقیت کو توسیع عطا کرتے ہیں۔مرد عورت پر اثر رکھتا ہے اور کچھ مرد تمام عورتوں اور مردوں کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں۔

شلامتھ فائرسٹون Shulamith Firestone کہتا ہے ''اقتصادی تفریق کے برخلاف جنسی تفریق کا راست تعلق جسمانی حقیقت سے ہے کہ مرد اور عورت کو یکساں جسمانی اعضا نہیں دیے گئے۔عورت اپنی جسمانی حفاظت کے لئے مرد پر انحصار کرتی ہے اس طاقت اور اختیار کی مساویانہ تقسیم نہیں ہو پاتی نتیجے میں نفسیاتی اور اقتصادی مسائل پیدا ہوتے ہیں طبقاتی درجہ بندی ظہور میں آتی ہے۔'' [1]

بعض انتہاپسندوں کا خیال ہے کہ عورت جسمانی اعتبار سے بھی مرد سے برتر ہوتی ہے۔ایشلے مونٹیج Ashley Montague کہتا ہے ''عورت کی ماں بننے والی صلاحیت سے مرد حسد کرنے لگا کیوں کہ بچے کو جنم دینا ایک عظیم تخلیقی عمل ہے۔اسی حد کے زیراثر مرد نے عورت کو احساسِ کمتری میں مبتلا کرنا شروع کردیا'' [2]

الپرٹ Alpert کہتا ہے ''ایک اچھے سماج میں طاقت کا سرچشمہ عورت کہلائے گی کیوں کہ ماں بننے کی صلاحیت صرف عورت میں ہوتی ہے۔اس بنیاد پر سماج کی تشکیل جدید ضروری ہے اور عورت کی حیثیت میں تبدیلی بھی ناگزیر ہے''۔

---

[1] Firestone. S., The Dialectic of Sex, 1970- P8

[2] Kalpana Shah "Women Liberation or Subjugation 1984 P. 14

اس دبستاں کے دو مختلف رجحانات ہیں۔ ایک عورت کو مساویانہ درجہ دینا چاہتا ہے دوسرا عورت کو برتر موقف میں دیکھنے کا خواہش مند ہے۔ یہ لوگ عورت کی معاشی حیثیت سے بحث نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ معاشی اعتبار سے مرد اور عورت دونوں استحصال کا شکار ہیں۔ دو مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والی عورتیں بھی ایک دوسرے پر ظلم کرتی ہیں۔ برتھ کنٹرول، اسقاطِ حمل اور دوسرے مطالبات کے مان لینے سے عورت کی سماجی حیثیت بلند نہیں ہوتی جب تک ٹکنالوجی کی طاقت مرد کے ہاتھ میں ہے اور اختیارات پر مرد قابض ہے عورت کی حیثیت بدل نہیں سکتی۔

اشتراکی نسائی تحریک:Socialist Feminism

اس مکتب خیال سے تعلق رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ برتری اور کمتری کا احساس مصنوعی اور خود ساختہ ہے۔ یہ خیال اساطیری حیثیت رکھتا ہے کہ عورت گھریلو کاموں کے لئے ہی مناسب ہے۔ عورت کی کمتری کی جڑیں دراصل خاندان میں پیوست ہیں۔

خاندان کا تصور عورت کو خانگی ملکیت سمجھنے سے ابھرا۔ جب تک عورت کو ذاتی ملکیت سمجھنے کا تصور ختم نہ ہوگا عورت مرد کے مساویانہ حقوق حاصل نہیں کر سکتی۔ زمانہ قدیم میں عورت اور مرد مساویانہ درجہ رکھتے تھے کیوں کہ اس دور میں ''باپ'' کا تصور ہی نہ تھا۔ Engles اینگلز سے پہلے اس تاریخی پس منظر کی تلاش کی جو جنسی تفریق پیدا کرتا ہے۔ اینگلز نے اپنی کتاب Origin of the Family میں عورت کی حیثیت وحشی دور میں، جنگلی دور میں اور تہذیب یافتہ دور میں کیا تھی اس کا جائزہ لیا۔ اینگلز کہتا ہے ماں بننے کی قدرتی صلاحیت کی وجہ سے عورت کو اونچا مقام حاصل تھا کیوں کہ کوئی مرد قدرتی طور پر مرد نہیں بن سکتا۔ اور پورے وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ کس بچے کا باپ کون ہے۔ وحشیانہ دور کے اختتام کے بعد جیسے جیسے معاشرہ مہذب کہلانے لگا عورت مرد کی غلام بنتی گئی۔ اٹھارہویں صدی میں عورت کی حیثیت کمتر ہوگئی۔ جب سے مہذب معاشرے میں نکاح

کی رسم شروع ہوئی عورت مرد کی ذاتی ملکیت بنتی گئی۔ اور پدرانہ معاشرہ ابھرتا گیا۔ اس سے قبل عورت کی حیثیت مرد سے بلند تھی۔ سوال یہ ہے کہ زمانہ قدیم میں اسے مرد کے مقابلے میں برتر موقف حاصل تھا تو پھر یہ زوال کیسے آیا۔

Engles اینگلز کہتا ہے کہ اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے ـــــ خانگی ملکیت کے تصور سے خاندان میں ایک بنیادی تبدیلی آئی خاندان میں کام کی تقسیم ہوئی مرد باہر کے کام انجام دینے لگا اور عورت گھریلو۔ اس طرح دھیرے دھیرے عورت کی حیثیت کمتر ہوتی گئی۔ ذاتی زمین، بیل اور دوسرے زرعی آلات خریدنے کا رواج ممالک میں عورت کی جو حیثیت ہے اس سے بہتر سرمایہ ممالک میں ہے روسی عورتوں کے شانوں پر آج بھی گھریلو زندگی کا بوجھ ہے۔ بچوں کی تربیت کی ذمہ دار بھی روسی عورت ہے۔ روس میں عورت کی حیثیت بلند کرنے کے لئے کئی قوانین بنائے گئے۔ شادی رجسٹریشن کے ذریعہ یا کسی سیول بیوریو میں کرنے کی اجازت دی گئی۔ عورت کو نوٹس کے ذریعہ طلاق لینے کا حق دیا گیا۔ اسقاطِ حمل کو قانونی موقف دیا گیا۔ جائز و ناجائز بچوں کے درمیان تفریق ختم کردی گئی۔ لیکن روسی مردوں نے ان قوانین کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ کارخانوں میں عورتوں کو روزگار دینے کی سختی سے مخالفت کی گئی۔ ۱۹۲۰ء کے وسط میں پارٹی لیڈروں بشمول لینین نے اس خیال کا اظہار کیا کہ Feminism نسائی تحریک، مارکسزم کے خلاف ہے۔ اور یہ رجحان طبقاتی جدو جہد کو جنسی جدو جہد میں تبدیل کر رہا ہے چنانچہ کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ میرج رجسٹریشن کو ضروری قرار دیا گیا۔ طلاق کے قانون میں بھی تبدیلیاں کی گئیں۔ دس بچے پیدا کرنے زور پکڑنے لگا۔ دوسری طرف ایک عورت سے شادی کا رواج بنا۔ اس کی وجہ سے باپ کا تصور بھی ابھرا۔ مشترکہ سماج کی جگہ انفرادی خاندان بنے پھر باب کے رشتے کو معنویت ملی۔ عورت اپنے چھوٹے سے خاندان کی دیکھ بھال کرنے لگی ساتھ ساتھ زراعتی کاموں میں وہ مرد کا ہاتھ بٹاتی رہی۔ بچوں کی دیکھ بھال اور گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ عورتیں گھر سے باہر کے کام بھی انجام دیتی رہیں۔ رفتہ رفتہ عورت

پورے سماج کے لئے نہیں بلکہ صرف اپنے خاندان کے لئے کام کرنے لگی۔اس طرح اس کا مرتبہ گھٹ گیا۔

اشتراکی نسائی تحریک والے جب یہ کہتے ہیں کہ شادی کے تصور کی وجہ سے عورت کی سماجی حیثیت میں کمی واقع ہوئی ہے تو کیا عورت کو ذاتی ملکیت سمجھنے کے تصور کو چھوڑ دینے سے اس کی حیثیت بلند ہو جائے گی؟ کیا خاندان کو ختم کر دینے سے مشترکہ سماج کا تصور دوبارہ بحال ہو سکتا ہے؟

جہاں تک عورت کی حیثیت کا سوال ہے سوشلسٹ والی ماں کو میڈل دیے گئے اور اسے ''ہیرو ین مدر'' کا خطاب دیا گیا۔تدریسی نظام میں تبدیلی کی گئی۔مخلوط ذریعہ تعلیم کو ختم کیا گیا لڑکے اور لڑکیوں کے علیحدہ مدارس بنائے گئے۔لڑکیوں کو Psychology , Anotomy اور Hygene کے کورس پڑھائے جانے لگے تاکہ وہ اچھی بیوی اور ماں بن سکے۔یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ Svetlana سوویتلانہ جو اسٹالن کی لڑکی تھی کہتی ہے ''اس کے والد نے عوام کے سامنے اس بات کا اعلان کیا کہ ''معاشی استحکام میں عورت نے نمایاں خدمات انجام دیں'' لیکن ذاتی طور پر وہ مرد اور عورت کی مساوات کا مخالف تھا[1] گھر، خاندان اور عورت کی حیثیت کے معاملے میں وہ قدامت پسند تھا انقلاب روس کے بعد عورت کو بہت سی مراعات حاصل ہوئیں۔تعلیم یافتہ خواتین کی تعداد میں اضافہ ہوا۔بچوں کی نگہداشت کے بہت سینٹر قائم ہوئے لیکن روسی عورتوں نے جو انقلابی تبدیلیوں کی توقع کی تھی وہ پوری نہ ہو سکی۔عورت کے کمتر درجے کی ایک وجہ معاشی اور سماجی پستی بھی ہے۔

کسی بھی انقلاب کے زمانے میں روس معاشی اور تہذیبی اعتبار سے پست تھا اس لئے بھی عورت کو مکمل آزادی نہیں مل سکی۔معاشی پستی فیتہ شاہی کو جنم دیتی ہے اگر اشیاء وافر مقدار میں ہو تو گاہک اپنی سہولت سے اشیاء خرید سکتا ہے لیکن اس کی کمی ہو تو پھر گاہک کو قطار میں کھڑا ہونا پڑے گا اور جب یہ قطار لمبی ہو جائے گی تو اس کو قابو میں رکھنے کے لئے

---

1. Kalpana Shah. Women's Liberation & Voluntory Action 1984 P. 18

پولیس مین کی ضرورت ہوگی اور یہی بیوروکریسی کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بچوں کی نگہداشت کے مراکز، لانڈریاں ریستوراں کی تعداد بڑھی ہے لیکن ساتھ ساتھ بیوروکریسی بھی بڑھی ہے چنانچہ معاشی استحکام کے باوجود عورت کو وہ مقام اور وقار حاصل نہ ہو سکا جس کی اسے جستجو تھی۔ روسی شوہر آج بھی اپنی بیویوں کے ساتھ ناروا سلوک کرتے ہیں۔ بہت سی روسی عورتیں اس تشویش میں مبتلا ہیں کہ وہ اپنی نسائیت کھوتی جا رہی ہیں اس مروجہ نظام کو بدلنے کے لئے روسی عورت کی جدوجہد معاشی اور سماجی بنیاد پر جاری ہے۔ جب تک یہ نظام تبدیل نہ ہوگا اشتراکی ممالک میں عورت کی حیثیت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوگی۔

چوتھا باب

نسائی حسیّت

نسائی حسیّت کی سب سے آسان تعریف یہ ہے کہ عورت اپنے مخصوص طرز فکر اور نسوانی نقطۂ نظر سے معاشرے کو دیکھے۔ یعنی عورت اپنے طور پر سماج کا مطالعہ کرے۔ موجودہ معاشرہ پدرانہ معاشرہ کہلاتا ہے اس لئے مائرا جہان کے مطابق ''پدرانہ دنیا کے باہر کوئی جگہ نہیں ہے جہاں سے عورت اپنا اظہار خیال کر سکتی ہے۔[1]

اس لئے جہاں جہاں عورت اس پدرانہ معاشرے میں اپنی حیثیت کو کمتر دیکھتی ہے وہ انحراف یا احتجاج کرتی ہے۔ پیدا کرنے والے نے مرد اور عورت دو مختلف جنس بنائی ہیں۔ جسمانی اعتبار سے دونوں میں فرق ہوتا ہے اس فرق کے پیچھے منشائے بقائے نسلِ انسانی نظر آتا ہے۔ یونان کی مشہور کہاوت ہے کہ مرد اور عورت دونوں ایک ہی جسم کے حصے تھے یہ دو حصے جدا کر دیے گئے اس لئے ایک دوسرے سے ملنے کو بے قرار رہتے ہیں اسلامی عقیدت کے مطابق عورت کو مرد کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے یعنی عورت مرد کے جسم کا حصہ ہے۔ دونوں مخالف جنسوں میں ایک دوسرے کے لئے بے پناہ کشش پائی

---

[1] مغنی تبسم۔ نسائی تنقید ایک تعارفی نوٹ (غیر مطبوعہ مقالہ)

جاتی ہے۔اس جذباتی جسمانی عمل کے نتیجے میں عورت ماں بننے کے مختلف مرحلوں سے گذرتی ہے تو اس کے جسم میں بے پناہ تبدیلیاں ہوتی ہیں جبکہ مرد کی جسمانی ساخت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔اس طرح بچے کی شناخت ماں کے وسیلے سے ہوتی ہے۔اس لئے جن دنوں معاشرہ مہذب نہ تھا وہ مادرانہ سماج کہلاتا تھا۔ماں بننے کے عمل نے عورت کی حیثیت کو بلندی عطا کی وہیں اس کے درجے میں کمی بھی ہوئی۔چونکہ مرد کے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں ہوتا جس کی بنیاد پر کسی بھی بچے کا باپ کہلائے۔اس سے مرد نے فائدے بھی اٹھایا دوسری طرف اس کی باپ کہلانے کی خواہش نے عورت کو ذاتی ملکیت بنانے کے تصور کو فروغ دیا۔کیوں کہ مرد کو اپنے آپ کو باپ کہلانے کے لئے عورت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔اس تصور نے عورت کو ذاتی ملکیت بنانے کی بنیاد ڈالی۔عورت کے سہارے کے بغیر مرد یہ ثابت ہی نہیں کرسکتا کہ کسی بچے کا باپ ہے۔چنانچہ عورت کو چار دیواری میں قید کر دیا گیا۔زمانۂ قدیم میں عورت اور مرد اکٹھے زندگی کے کاروبار میں مصروف رہا کرتے تھے۔ جسمانی ساخت کے اعتبار سے مرد موسم کی سختیاں جھیلنے، بار برداری کے کام اور سخت محنت کرنے میں مرد سے زیادہ طاقت ور ثابت ہوا۔عورت نے نسبتاً کم محنت والے کاموں کو ترجیح دی۔پھر قدرتی طور پر بعض مخصوص دنوں میں عورت زیادہ جسمانی محنت کے کام انجام نہیں دے سکتی۔جن دنوں وہ حاملہ ہوتی ہے یا رضاعت کے زمانے میں وہ اقتصادی دنیا سے کٹ جاتی ہے اور محنت مشقت اس سے ممکن نہیں ہوتی۔رفتہ رفتہ مرد بیرونی دنیا پر اپنا تسلط جمانے لگا۔اس میں ذاتی ملکیت کا تصور فروغ پانے لگا۔شکار کر کے وہ جانوروں کی کھالیں جمع کرنے لگا، زمین اور زر کے حصول کی کوشش کرنے لگا اسی طرح خوبصورت عورتوں کو اپنی ملکیت بنانے میں فخر محسوس کرنے لگا۔پھر زیادہ بچوں کا باپ کہلانے میں بھی اسے برتری کا احساس ہونے لگا۔اسلئے یہ ضروری تھا کہ عورتوں کو اپنی ذاتی ملکیت بنائیں ورنہ اس کے بغیر مرد بچوں کو اپنی شناخت نہیں دے سکتا تھا۔دوسری اشیاء کے حصول کی طرح عورتوں کی خاطر بھی لڑائیاں ہونے لگیں اور مقابلہ کر کے عورتوں کو جیتا جانے لگا۔جیسے جیسے

معاشرہ مہذب ہوتا گیا عورت اور مرد کے تعلقات کو قانونی و سماجی حیثیت دینے کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ اور لوگوں کی موجودگی میں عورت اور مرد ایک دوسرے کو قبول کریں۔ اس طرح شادی کا رواج ہوا۔ قبیلے، کنبے اور خاندان کے تصور نے اپنی جڑیں پھیلائیں۔ معاشرہ اور سماج نے عورت کی پاکبازی پر اصرار کیا۔ عورت کے باعصمت رہنے پر زور دیا جانے لگا 'شوہر' اور 'غیر مرد' کا تصوّر ابھرا۔ ایسی عورت کو سماج حقارت کی نظر سے دیکھنے لگا جس کے تعلقات شوہر کے علاوہ کسی اور مرد سے ہوں۔ بن بیاہی ماں گنہ گار سمجھی جانے لگی۔ عورت باعزت کہلانے کے لئے چار دیواری میں محدود ہوتی گئی۔ پھر اس نے اپنے آپ کو دوسرے سے چھپانا شروع کر دیا۔ خود مرد کے باپ کہلانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ کسی اور مرد سے اپنی عورت کو ملنے نہ دے۔ عورت کے احساسِ کمتری، عدم تحفظ کے احساس، اور مردوں پر انحصار کرنے کے پیچھے پاکدامنی کا تصور ہے جو سماج میں مروج ہوا۔ مرد پورے طور پر معاشرے پر قابض ہو گیا۔ رفتہ رفتہ بیرونی دنیا اور گھریلو دنیا میں فاصلہ بڑھتا گیا۔ عورت کو گھریلو دنیا سونپ دی گئی اور مرد اقتصادیات پر قابض ہو گیا۔ مرد کی دنیا زیادہ وسیع اور پابندیوں سے مستثنیٰ قرار پائی۔ اس معاشرے میں وہی عورت نیک اور اچھی سمجھی جانے لگی جو مرد کے اشاروں پر ناچے اور اپنے وجود کو مرد کی مرضی کے مطابق بنا دے۔ اس کی اپنی کوئی حیثیت باقی نہ رہے۔ مرد نے سارے اختیارات حاصل کر لئے۔ اور عورت کو کمتر اور غلام سمجھنے لگا۔ انسانی سماج ترقی کرتا گیا۔ اور مختلف معاشروں، سماج اور طبقات میں عورت کی حیثیت مختلف صورت اختیار کرتی گئی۔ مغرب کی عورت کے مسائل مشرق کی عورت کے مسائل سے مختلف ہیں کیوں کہ دونوں حصوں کے اقدار بھی الگ الگ تشکیل پا چکے ہیں۔ معاشی نظام نے سماج کو مختلف طبقات میں تقسیم کر رکھا ہے اس لئے ہر طبقے کی عورت کے مسائل الگ ہوتے ہیں۔ یہاں ہمارے زیر بحث ہندوستانی سماج ہے۔ ہندوستانی سماج میں عورت کی کوئی آزادانہ حیثیت نہیں ہے۔ شادی سے قبل وہ بیٹی اور بہن کی حیثیت سے زندگی گزارتی ہے۔ باپ، دادا، چچا اور بھائی کو یہ حق بنتا ہے کہ وہ جہاں چاہے اپنے خاندان

کی لڑکی کا رشتہ طے کردیں۔ ماں بچپن سے ہی لڑکی کے ذہن میں یہ بات بٹھادیتی ہے کہ وہ ایک سفر کرنے والا پرندہ ہے، دوسرے کی ملکیت ہے، ماں باپ کے گھر میں اس کی حیثیت ایک مہمان کی سی ہے، وہ ایک ایسی امانت ہے جسے دوسرے کو سونپنا ہے ایک ایسا پودا ہے جو غیر کی زمین میں پرورش پارہا ہے۔ اس لئے لڑکیوں کی زندگی کا مقصد اچھا بَر پانا ہے۔ ہندوستانی سماج میں عورت صرف بیوی، ماں،، بہن، بیٹی، بہو بن کر ہی سماج میں محفوظ رہ سکتی ہے۔ ایسی عورت بے سہارا سمجھی جاتی ہے۔ جس کے ساتھ کوئی مرد نہیں ہوتا۔ ایسی عورت کو غیر محفوظ سمجھ کر دوسرے مرد ہوس کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ اور کوئی ہمدردانہ رویہ نہیں رکھتا۔ بیوہ کی حفاظت اس کے بچے یا پھر اس کے مائیکے یا سسرال کے مرد کرتے ہیں۔ ہندوستانی سماج میں ساس کے بہت اختیارات ہیں وہ عورت جو اپنے شوہر کے گھر میں بہو بن کر آئی تھی جوان بیٹوں کی ماں بن کر طاقت ور ہو جاتی ہے۔ جو کچھ اس کے ساتھ پیش آیا وہی وہ اپنے بہو کے ساتھ دہراتی ہے۔ اس اختیار کو حاصل کرنے کی خواہش میں عورت لڑکوں کی ماں بننا چاہتی ہے۔ عورت جو گھریلو کام انجام دیتی ہے اس کی سماج میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ کام وہ بغیر اجرت کے کرتی ہے۔ مزدوری کرنے والی عورت کو مرد کے مقابلے میں کم اجرت دی جاتی ہے۔ اس مردانہ سماج میں عورت خود کی زندگی گذار رہی ہے۔ وہ رات دیر گئے گھر سے باہر نہیں نکل سکتی۔ اپنی مرضی سے تفریح نہیں کرسکتی۔ ہر کام کی انجام دہی میں شوہر کی اجازت ضروری تصور کی جاتی ہے۔ زنا بالجبر کے واقعات میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔ جہیز کی کمی کے باعث اس کا شوہر اور سسرالی رشتے دار اسے جلادیتے ہیں، عورت کی جسمانی کمزوری کو تعلیمی نظام، نظام ابلاغ جیسے سینما، ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ نمایاں کیا جاتا ہے عورت کو لاچار اور بے بس دکھایا جاتا ہے۔ شوہر کی اطاعت نہ کرنے والی عورت کا برا انجام پیش کیا جاتا ہے۔

جب عورت اس مردانہ معاشرے میں گھٹن محسوس کرتی ہے تو اس میں احتجاج اور انحراف کے جذبات ابھرتے ہیں۔ براؤن کہتا ہے عورت احتجاج اور انحراف اس وقت

کرتی ہے۔

۱۔ جب وہ یہ محسوس کرے کہ وہ دوسروں کے فائدے کے لئے کام کر رہی ہے اور اس کی محنت کا صلہ اسے نہیں مل رہا ہے بلکہ معاوضے کی تقسیم بھی غلط انداز میں ہو رہی ہے۔

۲۔ جب وہ یہ محسوس کرے کہ اس کی اپنی زندگی پر اس کا اختیار نہیں ہے اسے فیصلہ کرنے کا اہل قرار نہیں دیا گیا وہ اپنی پسند کی چیزوں کے انتخاب میں آزاد نہیں ہے۔

۳۔ عورت اس وقت خود کو کمتر محسوس کرتی ہے جب مرد آزادانہ انداز میں اس کے جسم پر حملہ آور ہوتے ہیں۔[1]

صنعتی ترقی نے مردوں کی جسمانی طاقت کی برتری کے فلسفے کی اہمیت کو ختم کر دیا۔ بہت سے کام مشینیں انجام دینے لگی ہیں۔ وہ کام جو مرد انجام دیتا ہے وہی کام اب عورت بھی انجام دے سکتی ہے۔ عورت نے اپنے حقوق کی جنگ شروع کی۔ اور مختلف تحریکیں شروع ہوئیں جس کا نقطۂ عروج فیمنزم کی صورت میں ظاہر ہوا۔ نسائی حسیت فیمنزم سے الگ ہے۔ یہ کسی خاص عقیدے یا Idealogy نہیں ہے بلکہ مردانہ سماج کو عورت اپنے طور پر دیکھتی اور سوچتی ہے۔ مختلف طبقات کی نسائی حسیت مختلف ہوتی ہے۔ نسائی حسیت کن اجزا پر مبنی ہے؟ اگر تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جو باتیں اہمیت کی حامل ہیں وہ ہیں حیثیت (Status) قدرت۔ (Power) آزادی عمل (Freedom of Action) منصب (Rank) اقتدار (Authority) نظریاتی قدر (Ideological Value) اور داخلی قدر (Subjective internalised value)

۱۔ Penelope Brown - "Universals and Particulars in the Position of women" Women in Society P.244

حیثیت(Status):

عام خیال یہ ہے کہ حیثیت ہی رتبہ ہے جبکہ علم سماجیات میں معاشرہ کی تنظیم میں کسی فرد کا عارضی طور پر حاصل کردہ رتبہ حیثیت کہلاتا ہے۔

قدرت (Power): ممکنہ مخالفتوں کے باوجود اپنی خواہش کے مطابق کچھ کرنے کی مقدرت، اس میں مسابقت، مخالفت اور دوسروں سے اپنی بات منوانے کا پہلو موجود ہے۔

آزادیٔ عمل (Freedom of Action): خود سے متعلق معاملات میں انتخاب اور فیصلہ کرنے کی بلاشرکت غیرے قوت، خود اختیاری، یہ قدرت سے مربوط تو ہوتی ہے، قدرت کی مرادف نہیں ہوتی کیوں کہ ہر دو کے میدان مختلف ہو سکتے ہیں۔

منصب (Rank): محدود وسائل تک رسائی کی درجہ بندی جس کا تعین ایک معاشرہ کے مخصوص معیارات کرتے ہیں — مرتبہ داری درجہ بندی جس میں اونچا مرتبہ مؤدبانہ رویہ کا ضامن ہوتا ہے۔

اقتدار (Authority): معاشرہ کا منظور کردہ اختیار — ایک خاص حلقہ اثر میں فیصلہ کرنے کا حق اور جوابی اطاعت۔

قدر (Value): خبر گیری وتحفظ یا مذہبی حسیت کا وہ درجہ جو سماجی موضوعات بشمول، اشخاص تک پھیلا ہوتا ہے۔

نظریاتی قدر (Ideological Value): مختلف اشخاص کی برتری یا کمتری کا تعین کرنے والے سماجی اعتبارات مثلاً جنسیت، نسل طبقہ، عمر —!

داخلی قدر (Subjective, Internalisied Value): خود آگاہی (دوسروں سے برتر یا کمتر ہونے کا تصور) اپنا درجہ متعین کرنے کی شعوری، کوشش!

ان ہی اجزا سے مل کر نسائی حسیت بنتی ہے۔ سماج میں کسی بھی فرد کے مرتبے کا

دوسرے فرد سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مرد اور عورت کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ لیکن جب مرد یا عورت اپنی انفرادی حیثیت اور اپنی ذات کا احساس کرنے لگتے ہیں تو ان کے سوچنے کا انداز مختلف ہو جاتا ہے وہ اپنی شناخت مختلف وسائل سے کرنا چاہتے ہیں۔ عورت جب اپنی حیثیت کے بارے میں سوچتی ہے تو وہ محسوس کرتی ہے کہ سماج اسے شوہر کے انتخاب کا، شادی کرنے یا نہ کرنے کے فیصلے کا اختیار، طلاق کے حصول کا، بچوں کی پیدائش اور تعداد کو مرضی کے مطابق رکھنے کا اسے اختیار نہیں ہے۔ اگر اختیار ہے بھی تو سماج اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ جو معاشرہ عورت کو یہ اختیارات (جن میں برتھ کنٹرول ابارشن وغیرہ شامل ہیں) دیتا ہے وہاں عورت کا موقف برتر ہے۔ معاشی اعتبار سے عورت خود مکتفی ہو۔ اقتصادی دنیا میں اسے مواقع حاصل ہوں اور وہ آزادانہ زندگی گذار سکتی ہو تو پھر وہ اس گھٹن سے نجات پا سکتی ہے۔ سماج نے عورت اور مرد کے ساتھ جو دہرا معیار قائم کر رکھا ہے اور معاشرے کی باگ ڈور پوری طرح مرد کے ہاتھوں میں ہے۔ ایسے ہر موقع پر عورت احتجاجی رویہ اختیار کرتی ہے جب یہ احتجاج اجتماعی شکل میں ہو تو تحریک کی شکل اختیار کرتا ہے۔ لیکن روزمرہ کی زندگی میں ایسے کئی واقعات ہوتے ہیں جہاں عورت مرد کے مقابلے میں خود کو غیر محفوظ، دوسرے درجے کی جنس اور کمتر محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اور ان معمولی باتوں کو کسی تحریک کا روپ نہیں دیا جا سکتا کیوں کہ یہ مسائل انفرادی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں بہت سے درد مشترک نہیں ہوتے۔ یہی نسائی حسیت ہے۔

(پچھلے صفحہ سے متعلق) ! Penelope Brown - "Universals and Particulars in the Position of Women "Women in Society

پانچواں باب

اردو ناولوں میں نسائی حسیّت (عصمت سے پہلے)

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان غیر یقینی حالات سے گذر رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی اجتہادانہ کوشش اور اس کے تلخ نتائج ایسے تھے کہ ساری ہندوستانی قوم سہم گئی تھی۔ اس خوف زدہ قوم کو انقلاب یا تشدّد پر اکسانا اس کی تباہی کا باعث ہوتا۔ ہندوستان ہر طرح کے سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی اور تہذیبی انحطاط میں گرفتار تھا۔ ۱۸۵۷ کے بعد ملک میں زبردست تبدیلی آئی۔ سرسید اور ان کے رفقا نے مسلمانوں کو ذلت سے نکالنے کی کوشش کی۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کی ذہنی، تربیت پر زور دیا۔ لیکن کام آسان نہ تھا کیوں کہ مسلمان جس سماجی پستی، مفلسی، جہالت، ادہام پرستی رسوم پرستی اور تن آسانی کے جال میں پھنسے تھے ان میں آگہی کا شعور بیدار کرنا اور اس جال کو توڑنا دشوار تھا۔ ہندوستان میں انگریزی تسلط نے زندگی کے مختلف شعبوں کی طرح ادب کو بھی متاثر کیا اور اردو میں کئی نئے اصنافِ ادب کا اضافہ ہوا۔

اردو کے اولین ناول نگار اور سرسید کے رفیق نذیر احمد نے بھی مسلمانوں کی بگڑی

۱؎ احسن فاروقی۔ اردو ناول کی تنقید تاریخ۔ ص۔ ۲۹

معاشرت کو صحیح راہ پر لانے کے لئے ناول یا تمثیلی قصوں سے مدد لی۔ اور بقول احسن فاروقی کہ "اس سلسلہ میں ان کی نگاہ سب سے پہلے امور خانہ داری پر پڑی" ؎

اس دور میں اصلاح نسواں کی جو تحریکیں چل رہی تھیں اسے مولانا نے اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ اپنی پہلی تصنیف مراۃ العروس (۱۸۶۹) میں وہ لڑکیوں کو خانہ داری کا سلیقہ سیکھنے اور ہنرمندی کی تعلیم دیتے ہیں۔ مولانا کے پاس تعلیم نسواں کا خاص تصور ہے۔ وہ لڑکیوں کے لئے گھر داری کے سلیقے پر زور دیتے ہیں۔ وہ سبق آموز قصے بیان کرتے ہیں اور دو قسم کی مثالیں دیتے ہیں۔ ایک سگھڑ پن کی دوسری پھوہڑ پن کی۔ اس کی نمائندگی اصغری اور اکبری کرتی ہیں۔ جگہ جگہ مولانا نصیحت آموز طویل وعظ کرتے ہیں۔ "بنات النعش"، "مراۃ العروس" ہی کا سلسلہ ہے اسے مولانا نے خود مراۃ العروس کا دوسرا حصہ کہا ہے۔ اس میں مولانا نے لڑکیوں کو خاص قسم کی تعلیم دی ہے۔ اس تعلیم کا تصور یہی تھا کہ عورت اپنے شوہر کو مجازی خدا سمجھے اور اپنے سگھڑ پن سے گھر کو "جنت" کا نمونہ بنائے۔ ایسی "جنت" جو اس سے صرف قربانیاں مانگتی ہے۔

"توبتہ النصوح" میں اولاد کی تربیت موضوع ہے۔ اس میں وہ مذہبی اصلاح کرتے نظر آتے ہیں۔ اس اصلاح میں کٹھ ملائیت ہے جو اولاد باپ کے حکم کے مطابق مذہبی پابندی نہیں کرتی اس کا انجام برا ہوتا ہے۔ "رویائے صادقہ" مذہبی مسائل پر مشتمل وعظوں کا مجموعہ ہے۔ "محصنات" میں انہوں نے کثرت ازدواج کے مسئلے کو موضوع بنایا۔ "فسانہ مبتلا" میں دو شادیوں کے خراب نتائج بتائے ہیں۔ مولانا کا خیال ہے ہے ایک شوہر کئی بیویوں کے ساتھ عدل نہیں کرسکتا اس لئے اسے ایک ہی بیوی پر قناعت کرنا چاہیے۔ شادی کے سلسلے میں دی گئی مذہبی مراعات کے غلط استعمال کو روکنے کی کوشش کے بعد مولانا نے جوان بیوہ کی شادی کو "ایامیٰ" میں موضوع بنایا۔ مولانا نے مذہب کی روشنی میں اخلاقی قدروں کا تعین کیا۔ ظاہر ہے یہ سارے قصے اصلاحی نقطۂ نظر سے لکھے گئے ہیں ایک مرد نے خاص نقطہ نظر سے عورت کی حیثیت متعین کی ہے اس لئے کسی قسم کی نسائی حسیت کی تلاش

بے معنی ہے۔ اس میں نذیر احمد نے مربیانہ وناصحانہ رویہ اختیار کیا۔ عورت کے درد اور اس کے نقطہ نظر کو محسوس ہی نہیں کیا۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار کو فسانہ آزاد، کی وجہ سے شہرت ملی۔ سرشار نے کئی ناول لکھے جن میں 'سیر کہسار' اور 'جامِ سرشار' مقبول ہوئے۔ سرشار نے اودھ کے زوال آمادہ معاشرے کو پیش کیا۔ جس معاشرے میں عورت کا عام تصور وقتی تفریح اور عشق بازی سے زیادہ نہ تھا عورت اس زمانے میں ہر بڑے چھوٹے اعلیٰ ادنیٰ کے حواس پر چھائی ہوئی تھی۔ بقول عصمت چغتائی ''سرشار کو بھلا شریف گھرانے کی عورت کہاں ملی ہوگی اور وہ بھی مسلمان خانہ ان کی اس وقت شریف بیویاں تو گھر میں بیٹھی ہنڈیا چولہے سے سر مار رہی ہوں گی۔'' [1]

''فسانہ آزاد'' کی ہیروین حسن آرا شاید اسی لئے اس معاشرے کی لڑکی نظر نہیں آتی یہ ایک مثالی کردار ہے۔ اس دور میں عورتوں کو تعلیم دلوانے کا رواج عام نہ تھا لیکن حسن آرا اعلیٰ تعلیم یافتہ، علم فلسفہ اور منطق میں ماہر لڑکی ہے۔ وہ علمی مسائل پر گفتگو کرتی ہے مباحث میں دلائل سے کام لیتی ہے۔ اپنی شرائط پر شادی کرتی ہے۔ اس کا مزاج رومانٹک ہے۔ آزادی سے دریا کی سیر کو جاتی ہے۔ اس کردار میں سرشار کوئی نسائی حسیت نہیں پیش کر سکے۔ یہ ان کے تخیل کی لڑکی ہے۔ البتہ ثریا جس کی شادی ایک بڈھے سے ہوتی ہے پوری وفاداری سے زندگی گذارتی ہے بڈھے کے انتقال کے بعد وہ آزاد کے عشق میں گھر سے بھاگ جاتی ہے ثریا بھٹیارن، جوگن اور بٹیرن کے مختلف روپ میں نظر آتی ہے۔ سرشار نے اس کردار کے ذریعہ بے جوڑ شادی کے مسائل۔ بیوہ کی دوسری شادی۔ بے سہارا عورت کی حفاظت کا مسئلہ۔ نادانستگی میں پیش کیا۔ ثریا مردوں کے سماج میں اپنی نسائیت کے ساتھ زندگی گذارنے کی جدوجہد کرتی ہے اور حفاظتِ خوداختیاری کا ہنر جانتی ہے۔

''جام سرشار'' کی ظہورن اور ''سیر کہسار'' کی قمرن بھی ان کے اہم کردار ہیں۔ لیکن سرشاری کے ہاں عورت گلیمر کے لئے استعمالی ہوتی ہے یا عبرت کا درس دینے۔

---

[1] عصمت چغتائی ''ہیروئن'' — ایک بات۔ نیا ادارہ لاہور۔ ص۔ ۹۵

عورت کے مسائل کو سمجھنے کا درک سرشار کو نہیں تھا۔

عبدالحلیم شرر کی شہرت تاریخی ناول نگار کی ہے۔ لیکن شرر کے بیشتر نسوانی کردار دنیا کی سب سے حسین جمیل و نازک لڑکیاں ہوتی ہیں۔ شرر نے عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ۔ بیوگی کے مسائل پردے کی خرابی اور بچپن کی شادی کے مسائل کو موضوع بنایا۔ وہ عورتوں کی تعلیم کے حامی اور پردے کے مخالف تھے۔ انہوں نے اس موضوع پر ایک ناول ''بدر النساء کی مصیبت'' لکھا۔ لیکن ان پر مثالیت پسندی اور مذہبیت کا غلبہ ہے۔ مولانا کا مقصد اصلاح نسواں کے ساتھ ساتھ بیداری نسواں تھا۔ انہوں نے عورت کے نقطہ نظر سے سماج کو نہیں پرکھا۔ اس لئے نسائی حسیت کہیں نظر نہیں آتی۔

رسوا نے پانچ ناول لکھے لیکن سب سے اہم ناول ''امراؤ جان'' ہے۔ لکھنؤ کے زوال پذیر معاشرے اور طوائفوں کی زندگی پر یہ ایک اہم ناول کہلاتا ہے۔ رسوا طوائفوں کے ہمدرد نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ بقول عصمت چغتائی: طوائف اتنی بازاری اور کاروباری قسم کی نہ تھی وہ بالکل شریف زادیوں سے زیادہ خوش اخلاق خوش اور لطیف تھی .... ہر مرد کی اتنی حیثیت کہاں کہ تعلیم یافتہ باسلیقہ بیوی شاندار مکان میں پھولوں سے لدی اور عطر میں بسی ہوئی رکھے لہٰذا اُس نے اس کا نہایت آسان علاج نکالا گھر میں بیوی رکھی جو علاوہ نسل بڑھانے کے دوسری ضرورتوں کو بھی پورا کرتی رہی اور بازار میں طوائف جو جذباتِ لطیفہ کی پال پوس کرتی رہی یہ بڑا کارآمد انتظام ثابت ہوا۔ گھر بھی رہا اور رنگینیاں بھی—'' [1]

''امراؤ جان'' آپ بیتی کے انداز میں لکھی گئی۔ لیکن اس میں مردانہ نقطہ نظر ملتا ہے جو رسواء کا ہے۔ رسوا اخلاقیات کا درس دیتے ہیں۔ آخر میں امراؤ جان کا توبہ کرنا خالص اخلاقی پہلو ہے۔

پریم چند نے پندرہ ناول لکھے۔ ان کے ابتدائی تین ناول ''اسرار معابد''، ''روٹھی رانی'' اور ''ہم فرما ہم ثواب'' ہیں۔ ان میں انہوں نے رسمی انداز میں سماجی مسائل کو روایتی انداز

---

[1] عصمت چغتائی۔ میرو ین۔ ایک بات۔ نیا ادارہ لاہور ص۔ ۹۵

میں پیش کیا۔ ''ہم خرما ہم ثواب''، ''جلوۂ ایثار'' اور ''بیوہ'' میں بیوگی اس کی اخلاقی گراوٹ با عزت زندگی گذارنے میں معاشی مشکلات کو پیش کیا۔ ''جلوہ ایثار''، ''بیوہ'' اور ''بازار حسن'' کے برجن، مادھوی، امرت رائے پورنا، سمن آشرم اور سیوا سدن میں پناہ لیتے ہیں۔ بیوہ کے مسائل کا حل پریم چند بھگتی اور آشرم میں تلاش کرتے ہیں۔ پریم چند نے ہندوستانی سماج میں عورتوں کی حیثیت کا عمیق مطالعہ کیا۔ اس دور کی عورت کوئی انفرادی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ خاندانی و سماجی مسائل میں وہ رائے دینے کا حق نہیں رکھتی تھی۔ اس کی زندگی کا مقصد شوہر کی سیوا کرنا اس کے بچوں کی پرورش کرنا تھا۔ شوہر کی محبت کے ثبوت میں ستی ہو جانا معمولی سی بات تھی کیوں کہ بیوہ دوسری شادی کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ شوہر کی جائیداد یا ملکیت میں عورت کا کوئی حق نہ تھا۔ روزی کمانا عورت کے لئے بڑا عیب سمجھا جاتا تھا۔ اس کی زندگی دوسروں کے رحم و کرم پر ہوتی تھی اس لئے وہ زندگی پر موت کو ترجیح دیتی تھی۔ پریم چند نے بے جوڑ شادی کو بھی موضوع بنایا۔ جہیز کی بدترین رسم کی بھی انہوں نے مخالفت کی جس کے نتیجے میں لڑکیاں بڈھے اور بدکار مردوں سے شادی کرنے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔ پریم چند جانتے تھے ''بازارِ حسن'' کی رونق انہی بیواؤں اور بے جوڑ شادی کا شکار عورتوں سے ہے پریم چند نے یہ سارے ناول اصلاحی نقطہ نظر سے لکھے۔ ''بازار حسن''، ''بیوہ''، ''گوشۂ عافیت'' اور ''نرملا'' وہ مردانہ سماج کی سخت گیری سے ہندو عورت کو نجات دلانے کی فکر کرتے نظر آتے ہیں۔

میدان عمل، غبن اور گئو دان ان کے اہم ناول ہیں۔ پریم چند نے ''گئو دان'' میں عورت کے رتبہ پر بھی روشنی ڈالی۔ پریم چند عورت کو مرد کے جذبہ تعیش کی تسکین کا ذریعہ نہیں سمجھتے۔ بلکہ اس کی زندگی کی تکمیل کا سبب سمجھتے ہیں۔ سید علی حیدر لکھتے ہیں۔

''گئو دان میں عورت انسانی حقوق اور مکمل آزادی کے لئے جدو جہد کرتی ہے سماج میں استحصال اور نا برابری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے۔ لیکن اس کے

---

[1] سید علی حیدر اردو ناول سمت و رفتار۔ الہ آباد ص۔۱۴۲

کردار کا بنیادی محور گرہستی ہے۔ جس میں وہ محبت ایثار قربانی اور خدمت گذاری کی زندگی گزارتی ہے۔ وہ مذہب سے وابستہ ہوتی ہے اور روح کو بالیدگی اور مزاج میں سپردگی کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔"[1]

پریم چند کے ناولوں میں اصلاح کا عنصر حاوی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عورت مرد کو سیوا کے ذریعہ ہی رام کر سکتی ہے۔ پریم چند عورت کو مظلوم سمجھتے ہیں۔ انہوں نے مردوں کی زیادتی کے خلاف احتجاج کیا لیکن ان کے پاس نسائی حسیت نہیں ملتی۔ وہ عورت کو اس کے

جذبات کو ایک 'مرد' کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

اس طرح عصمت سے پہلے لکھنے والے ناول نگاروں کے ہاں اخلاقی واصلاحی نقطہ نظر ملتا ہے۔ ان میں نسائی حسیت نہیں ملتی۔

☆☆

اردو افسانوں میں نسائی حسیّت (عصمت سے پہلے)

اردو افسانے کا آغاز بیسویں صدی کی ابتداء میں ہوا۔ ابتداء ہی سے اس میں دو واضح میلانات ملتے ہیں۔ ایک حقیقت نگاری اور اصلاح پسندی کا دوسرا رومانیت کا۔ حقیقت نگاری کی نمائندگی پریم چند اور رومانیت کی نمائندگی سجاد حیدر یلدرم کررہے تھے۔ پریم چند کے افسانوی مجموعے ''سوزوطن''، ''پریم پچیسی''، ''پریم بتیسی'' کے نام سے شائع ہوئے۔ سجاد حیدر یلدرم کے افسانوی مجموعے ''خارستان''، '' گلستان'' کے نام سے شائع ہوئے ان کے علاوہ سلطان حیدر جوش کا افسانوی مجموعہ ''فسانۂ جوش'' بھی منظر عام پر آیا۔

پریم چند کے ابتدائی افسانوں میں جذباتی اشتعال، وطن اور قوم کے ساتھ بے لوث جذبۂ عقیدت ملتا ہے۔ بعد میں انہوں نے ماضی کو مثال بنا کر قوم کو جگانے کی کوشش کی ان افسانوں میں درس ونصیحت کا پہلو واضح تھا۔ ''رانی سارندھا''، ''گناہ کا گانی کنڈ'' وغیرہ اسی زمرے میں آتے ہیں۔ ''عفو''، ''دل کی رانی''، ''نمک کا داروغہ'' وغیرہ گاندھیائی افکار وعقائد سے متاثر ہوکر لکھے گئے۔ رشتوں کی نزاکت اور انہیں نفسیاتی طریقے سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش پریم چند نے ''آشیاں برباد''، ''ثامی''، ''عیدگاہ'' اور

''پوس کی رات'' جیسے افسانوں میں کی۔ ''خانہ برباد''، ''استعفیٰ''، ''بڑے گھر کی بیٹی'' میں ذہنی و جذباتی کرب کو پیش کیا۔ پریم چند حقیقت نگاری کی بنیاد ڈالی وہ قصے کو اخلاقی موڑ دیتے تھے۔ ''تریا چرتر'' اور ''گناہ کا گن کنڈ'' ایسی کہانیاں ہیں جس وہ مرد وعورت کے باہمی تعلقات کی پیچیدہ حقیقتوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ڈاکٹر صادق لکھتے ہیں ''پریم چند کے یہاں عورت بیوی، ماں اور بہن کی حیثیت سے سامنے آتی ہے لیکن اسے محبوبہ بننے کی اجازت مشکل ہی سے ملتی ہے وہ وفا شعار، صابر، قانع اور پاک باز ہے گویا عورت سراپا ضبط تحمل اور اخلاص وقربانی کا نام ہے۔ پریم چند کا اصلاحی ذہن اسے دیوی کے روپ میں پیش کر کے ہی سکون حاصل کرتا ہے پریم چند نے صنف نازک کی نزاکت کے بجائے اس کی مجبوریوں اور بدحالیوں کا نقشہ کھینچا ہے۔'' [1]

بعد میں پریم چند نے نئی ''بیوی'' جیسا افسانہ لکھا جس کے متعلق ڈاکٹر قمر رئیس کا خیال ہے کہ یہ انگارے کے بعد جوفن کا تصور بدلا اس سے متاثر ہو کر پریم چند نے اس طرح کی کہانی لکھی۔ ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں ''دلاری اور انگارے کی دوسری کہانیوں میں فن کا یہی وہ نیا تصور تھا جس نے نہ صرف حیات اللہ انصاری اور سہیل عظیم آبادی جیسے نوجوان ادیبوں کو متاثر کیا بلکہ پریم چند جیسے کہنہ مشق ادیبوں کو بھی اپنے فن کی پرانی روش بدلنے اور کفن اور نئی بیوی جیسے افسانے لکھنے پر اُکسایا۔'' [2]

''نئی بیوی'' پریم چند کی پچھلی کہانیوں سے مختلف ہے ان کی کہانیوں میں پتی ورتا، کرم دھرم اور پتی پرمیشور کا جو چرچا ہے اس کہانی میں یہ سارے اخلاقی آدرش ڈھیر نظر آتے ہیں۔ ''نئی بیوی'' میں ایک نوجوان عورت کی شادی مالدار بڈھے سے ہو جاتی ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ محبت دولت سے خریدی جا سکتی ہے۔ نئی بیوی معمر شوہر سے زیادہ نوجوان دیہاتی نوکر کی طرف مائل ہے۔

---

[1] ڈاکٹر صادق — ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ 1981ء — ص۔۲۱۸

[2] قمر رئیس۔ — تنقیدی تناظر (۱۹۷۸ء) — ص۔۱۸۰

''اس نے (نئی بیوی نے) جلدی سے سر پر آنچل کھینچ لیا اور نوکر سے یہ کہتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی۔'' لالہ کھانا کھا کر چلے جائیں گے تم ذرا آ جانا...... پریم چند نے ایک نوجوان بیوی کو 'بد اخلاقی' کی طرف بڑھتے ہوئے دکھایا۔ اس افسانے میں عورت مروجہ مردانہ سماج کے خلاف احتجاج کرتی نظر آتی ہے۔ یہ نئی عورت پریم چند کی دوسری عورتوں کی طرح پتی ورتا، صابر شاکر و قانع نہیں ہے۔ ''بلیدان'' میں گردھاری کی بیوی سوبھاگی ایک ایسی عورت ہے جو استحصال کرنے والے طبقے کے خلاف سخت احتجاج کرتی نظر آتی ہے۔ اس افسانے کے حوالے سے پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں'' کیا یہ واقعہ نہیں کہ پریم چند کے کرداروں میں اگر کہیں جان دکھائی دیتی ہے تو صرف عورتوں میں۔ ناانصافیوں سے لڑنے کی کسی میں سکت ہے تو عورتوں میں، یا احتجاج یا سنگھرش کا کوندا لپکتا ہے تو انہیں کرداروں میں جو اگرچہ حیاتیاتی طور پر کمزور ہیں لیکن ان کے اندر کے انسان نے ابھی دم نہیں توڑا یا حالات کے جبر نے انہیں ابھی پاش پاش نہیں کیا۔''[1]

پریم چند کے افسانوں میں عورت بدلتی تو نظر آتی ہے لیکن نسائی حسیت کا کوئی تصور ان کے ہاں نہیں ملتا۔ اس کے ابتدائی نقوش پائے جاتے ہیں۔

علی عباس حسینی نے پریم چند کی تقلید کی ان کے پاس عورت کا جو تصور ملتا ہے ان کے افسانے بیوی کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے واضح ہوتا ہے۔

''عورت ایک موسمی پھل ہے یا اس سے وقتی مسرت حاصل کر و اسے گلے کا ہار نہ بناؤ ورنہ پنکھڑیاں کچھ ہی دن میں مغیلاں بن جائیں۔''

''عورت ناگن ہے بڑی ہی خوبصورت بڑی ہی نازک بڑی ہی سبک مگر بڑی ہی زہریلی۔''

علی عباس حسینی کا موضوع عورت کا حسنِ زاہد فریب، معاشرتی زندگی میں مشرق اور مغرب کا تصور سیاسی انحطاط کی وجہ سے روسا اور امرا کے طبقے میں پھیلی ہوئی عیاشیاں اور

---

[1] گوپی چند نارنگ افسانہ نگار پریم چند۔ اردو افسانہ روایت اور مسائل (۱۹۸۱ء)

سماج میں خیر وشر کی قوتوں کا باہمی تصادم ہے۔

اردو میں رومانوی تحریک کے علمبردار افسانہ نگار سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری اور حجاب امتیاز علی ہیں۔ یہ افسانہ نگار جمال پرست تھے ان کے ہاں حسن کا جو تصور ملتا ہے وہ تخیلی، مثالی اور ماورائی ہے۔ سجاد حیدر یلدرم کے ابتدائی افسانوں میں ''خارستان و گلستاں''، ''سودائے سنگین''، ''لیلیٰ مجنوں'' اور ''چڑیا چڑے کی کہانی'' ہیں۔ یلدرم نے جس عورت کو پیش کیا وہ نسائیت، شعریت اور لطافت کا بہترین امتزاج ہے۔ وہ محبت کے تقدس کے قائل ہیں ان کے نزدیک زندگی محبت کرنے کے لئے ہے۔ محبت کے لئے وہ شادی کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کی عورت تعلیم یافتہ جدید تہذیب کی پروردہ اور آزاد خیال ہوتی ہے۔ یلدرم کی ہیروین کے بارے میں ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں۔

''یلدرم کے افسانوں کی ہیروین عموماً تعلیم یافتہ جدید تہذیب کی پروردہ اور آزاد خیال ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان صفات سے متصف خواتین مسلم معاشرے میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہی سبب ہے کہ یلدرم اپنے افسانوں میں جو مثالی عورت کا کردار لانا چاہتے ہیں وہ مسلمانوں میں عموماً نہیں تھی یہ یلدرم کی وہ مجبوری تھی جو (آئیڈیل عورت کو پیش کرنے کی خواہش اور مسلم معاشرے میں ایسی خواتین کے وجود کی آرزو) انہیں پارسیوں کے معاشرے تک لے جاتی ہے''۔[1]

یلدرم کی عورت تخیلی اور ماورائی ہے۔ یہ سب خیالی حسینائیں ہیں۔

نیاز فتح پوری خدا کے وجود کے اس لئے قائل ہیں کہ اس نے عورت کو پیدا کیا۔ وہ لکھتے ہیں ''میرے نزدیک خدا کے پاس اس سے زیادہ زبردست دلیل اپنے وجود کو تسلیم کرانے کے لئے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی کہ اس نے عورت ایسی چیز پیدا کی۔''[2]

نیاز کو مناظر فطرت میں بھی عورت نظر آتی ہے۔ ان کا نظریہ رومانی ہے۔ نیاز

۱؎ ابوالکلام قاسمی۔ یلدرم کے افسانوں کی تاریخ اور تخلیقی اہمیت۔ تخلیقی تجزیہ ص ۲۱

۲؎ نیاز فتح پوری۔ یکہ ازغوازی (۱۹۴۲ء) ص۔ ۸

عورت کو کس زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں اس کی ایک مثال یہ اقتباس ہے۔

"عورت ایک رومانیت ہے قابلِ لمس، نورانیت ہے صاحب نطق، ایک روشنی ہے جسے ہم چھو سکتے ہیں۔ ایک حلاوت ہے جو ہاتھوں سے چکھی جاتی ہے ایک موسیقی ہے جو آنکھوں سے سنی جاتی ہے۔[1]

ڈاکٹر امیر عارفی لکھتے ہیں "نیاز کے افسانوں کی فضا عورت اور اس کے حسن کے گرد گھومتی ہے۔ حسین مناظر ہوں یا بمبئی کا ساحل اپالودکن کی دلنواز شام ہو یا ایک پارسی دوشیزہ، عصری زبیدہ کا ذکر ہو یا ہندوستانی حُسن کا اس کے قد وقامت اس کی آرائش، جذبات و احساسات کا ذکر جہاں کہیں بھی آجاتا ہے نیاز کا قلم اپنے جوہر دکھانے لگتا ہے"۔ [2]

نیاز افسانوں کے ذریعے اپنے عقائد ونظریات کا پرچار بھی کرتے ہیں۔ نیاز عورت کی آزادی، تعلیم نسواں، لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کی خرابیاں اور گھریلو اور سماجی ذمہ داریوں سے کنارہ کشی کو مضر سمجھتے ہیں۔ "شہید آزادی" کا ہیرو رشید بیوی کے متعلق جو نظریہ رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ

"اس کے نزدیک بیوی کا مفہوم ایک انیس و ہمدم کا تھا جو بہرا بھی ہو اور اندھا بھی اس کی ساری دنیا شوہر کی ذات ہو۔" [3]

اس طرح کے خیالات رکھنے والے افسانہ نگار کے ہاں انسائی حسیت ڈھونڈنا ایک مہمل کوشش ہے۔ نیاز عورت کو مغرب کی تقلید کرنے سے باز رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی ہیروئنیں آزاد خیال تعلیم یافتہ موسیقی کی دلدادہ شعر و ادب کی شوقین غرض ہر فن سے واقف لیکن گھریلو ذمہ داریوں کو بوجھ نہیں سمجھتیں۔ اور جو بوجھ سمجھتی ہیں آزادی سے غیر ضروری فائدہ اٹھاتی ہے وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ وہ عورت کی محدود آزادی کے قائل ہیں وہ

---

[1] نیاز فتح پوری۔ عورت۔ نگارستان (۱۹۳۹ء) ص۔۱۳

[2] امیر عارفی۔ نیاز فتح پوری۔ انجمن ترقی اردو دہلی (۱۹۷۷ء) ص۔۱۳۶

[3] نیاز فتح پوری۔ شہید آزادی۔ جمالستان ص۔۴۵

اسے گھر کی زینت سمجھتے ہیں ان کے پیش نظر عورت کا دائرہ صرف گھر کی چار دیواری میں شوہر کی خدمت اور بچوں کی تربیت تک محدود ہے۔

مجنوں گورکھپوری کے ہاں سجاد انصاری اور یلدرم کے مقابلے میں رومانیت سنبھلی سنبھلی سی ہے۔ مجنوں کی کہانیوں میں محبت ناکام ہو جاتی ہے اور کردار گھل گھل کے مر جاتے ہیں۔ مجنوں کی رومانیت محبت اور شادی کو علیحدہ کر دیتی ہے۔ وہ محبت کے معاملے میں شادی کی رسم کو غیر متعلق اور فضول سمجھتے ہیں۔ ان کا نسوانی کردار کہتا ہے۔

''شادی تو دنیا کا کاروبار ہے اسے محبت سے کیا سروکار ہے'' [1]

ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں ''محبت اور شادی کو جدا کر دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی کا ایک صحت مند رجحان بننے کے بجائے وہ زندگی کا ایک تضاد بن گئی'' [2]

مجنوں کے ہاں عورت کا تصور ماورائی ہے۔ ان کے نسوانی کردار زندگی سے فرار حاصل کر کے آرزومندی میں پناہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

حجاب اسمٰعیل خاتون افسانہ نگار تھیں۔ لیکن حجاب کے ہاں شعریت ہے۔ ان کی عورت حسین اور معصوم ہے۔ وہ واحد متکلم کے صیغے میں افسانے لکھتی تھیں لیکن انہوں نے عورت کا وہی تصور پیش کیا جو دوسرے مرد رومانوی تحریک کے افسانہ نگاروں کے پاس ہے حجاب کے افسانوں میں محبت کو مرکزیت حاصل ہے لیکن محبت تخیلی ہے جو موت کو تک خاطر میں نہیں لاتی۔

مختصر یہ کہ رومانی افسانہ نگاروں نے عورت کے مسائل اور شادی بیاہ کے مروجہ رسومات کے خلاف لکھا۔ لیکن شادی بیاہ کے مسائل اور آزادی نسواں کے مسئلہ کو ان لوگوں نے صرف اس لئے اٹھایا کہ ان مسائل کا تعلق عورت سے ہے۔ ان مسائل کو حل کرنے کے بجائے وہ عورت کے حسن اس کی دلفریب اداؤں کے بیان میں الجھ کر رہ جاتے

---

[1] مجنوں گورکھپوری۔ خواب وخیال ص۔۶۵

[2] محمد حسن اردو ادب میں رومانوی تحریک ۱۹۵۵۔ ص ۴۶۔

ہیں۔ رومانوی تحریک کے افسانہ نگاروں نے سماج کو عورت کی نظر سے نہیں دیکھا۔ ان کے کردار حقیقت سے دور تخیلی ہوتے تھے۔

''انگارے'' اردو افسانوی ادب میں خاص اہمیت رکھتے ہیں یہ ایک نئی نسل کے طرز فکر و احساس اور ایک نئے تصورِ فن کا آغاز تھا۔ یہ مجموعہ ۱۹۳۲ء میں منظر عام پر آیا۔ 'انگارے' کے افسانہ نگار سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر تھے۔ یہ سارے تعلیم یافتہ نوجوان تھے جو مغربی تعلیم سے بہرہ ور تھے۔ ان افسانہ نگاروں نے ہندوستان کے سماج میں جنسی گھٹن، اقتصادی بدحالی اور سماجی نابرابری کے خلاف آواز بلند کی۔ پہلی بار عورتوں کے کرب کو محسوس کیا گیا۔ اس مجموعہ میں احمد علی کی کہانی ''بادل نہیں آتے'' شامل ہے۔ شعور کی رو کی تکنیک کے ذریعہ انہوں نے عورت کے محسوسات کو پیش کیا۔ پہلی بار ایک عورت اپنی حیثیت اور سماج کے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھتی ہے۔ احمد علی نے مسلم گھرانے کی شادی شدہ لڑکی کی ذہنی کیفیت اجاگر کی ہے اس کی شادی مرضی کے خلاف ایک خدا پرست مولوی سے کر دی جاتی ہے۔ احمد علی نے اس شادی شدہ لڑکی کے احتجاج کو پیش کیا مولوی کی جنسی لذت پرستی، عورت کی بے بسی اور مکروہ ازدواجی تعلق کو بے نقاب کیا۔ بیرونی زندگی میں یہ مولوی متقی اور پرہیزگار کہلاتا ہے۔ لوگ اس سے عقیدت رکھتے ہیں تعویز لے جاتے ہیں۔ وہ لڑکی سوچتی ہے ''نگوڑے بادل نہیں آتے ...... گرمی اس تڑاخے کی پڑ رہی ہے کہ معاذ اللہ تڑپتی ہوئی مچھلی کی طرح بھنے جاتے ہیں۔ عورت کمبخت ماری کی بھی کیا جان ہے ۔۔۔ کام کرے کاج کرے اس پر طرہ یہ کہ بچے جننا۔ جی چاہے نہ چاہے جب میاں موئے کا جی چاہا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا'' [۱]

احمد علی نے عورت کے انداز میں اس سماج کو دیکھا عورت کو ذہنی احتجاج اسی کی زبان میں پیش کیا۔ اس افسانے میں عورت کا حقیقی ردعمل اور ذہنی حالت کا اظہار ملتا ہے جو

---

۱ احمد علی انگارے ص۔۷۳

بحوالہ تنقیدی تناظر۔ قمر رئیس۔ ص ۷۶

اپنی بے بسی پر محسوس کرتی ہے۔ یہی نسائی حسیت ہے۔

سجاد ظہیر کی ''دلاری'' ایک دولت مند گھر میں پرورش پانے والی ایک بے سہارا لڑکی کی کہانی ہے۔ اس گھر کے بڑے صاحبزادے کاظم دلاری کو اپنی ہوس کا شکار بناتا ہے۔ کاظم کی شادی ایک امیر زادی سے طے ہو جاتی ہے شادی سے کچھ روز قبل دلاری غائب ہو جاتی ہے اور چند مہینوں بعد وہ جسم فروش عورتوں کے محلے میں پائی جاتی ہے۔ کاظم علی کا نوکر اسے سمجھا کر گھر لاتا ہے۔ سب دلاری کو ذلیل کرتے ہیں خاص طور پر کاظم علی کی نئی دلہن۔ دلاری چپ چاپ ساری باتیں سہہ لیتی ہے لیکن کاظم علی اپنی دلہن کے ساتھ نکل کر جب یہ کہتے ہیں ''امی خدا کے لیے اس بدنصیب کو اکیلی چھوڑ دیجئے۔ وہ کافی سزا پا چکی ہے۔ آپ دیکھتی نہیں کہ اس کی حالت کیا ہو رہی ہے'' یہ سن کر دلاری تڑپ اٹھتی ہے۔ وہ یہ برداشت نہیں کرتی کہ جسے اس نے اپنا کنوار پن سونپا۔ جس کی وجہ سے وہ گھر سے فرار ہو گئی وہ اس پر ترس کھائے۔ اس کی نسوانی غیرت وحمیت اس ذلت کو سہنے کے بجائے رنڈی بن کر رہنے کو گوارہ کرتی ہے۔ سجاد ظہیر کوئی اخلاقی درس نہیں دیتے وہ عورت کے روحانی کرب کو پیش کرتے ہیں سارے واقعہ کو وہ عورت کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور یہی وہ پہلو ہے جو اردو افسانے میں پہلی بار نسائی حسیت کی نشاندہی کرتا ہے محمود الظفر کا افسانہ ''جواں مردی'' مرد کے جھوٹے پندار پر ایک طنز ہے۔ رشید جہاں کا افسانہ ''دلی کی سیر'' عورت کی سماجی آزادی پر ایک مضمون نما کہانی ہے۔ یہ افسانے فنی اعتبار سے خام سہی لیکن اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی باتیں جن کے کہنے میں لوگ جھجک محسوس کرتے تھے ان سے پہلے کے افسانہ نگاروں نے دیدہ دانستہ پہلو تہی کی تھی ان افسانہ نگاروں نے اسے کھول کر بیان کیا ایسے بہت سے مسائل جو ادب کی دنیا میں شجر ممنوع بنے ہوئے تھے انہیں ان افسانہ نگاروں نے موضوع بنایا۔

نسائی حسیت کے ابتدائی نقوش بھی انہی افسانوں میں ملتے ہیں۔ ان تمام لکھنے والوں کو ہندوستانی خواتین سے ہمدردی خاص طور پر متوسط طبقے کی عورتیں جو حبس اور گھٹن کی

زندگی گذار رہی تھیں ان کے افسانوں کا موضوع بنیں۔ ان افسانہ نگاروں نے عورتوں کے مسائل ان پر مردوں کا ظلم و جبر اور سماج کی ٹھکرائی اور ستائی ہوئی عورتوں کے بارے میں ہمدردی سے سوچا اور ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی جس میں عورت نہیں بلکہ مردانہ سماج ذمہ دار نظر آتا ہے۔ ان لوگوں نے عورت کے سلسلے میں سرپرستانہ، مربیانہ و ترحمانہ رویہ اختیار نہیں کیا بلکہ عورت کی روح میں جھانکنے کی کوشش کی۔ متوسط طبقے کے مسلم گھرانوں کی زندگی گھریلو تفصیلات اس طبقے کی عورتوں کی زبان محاورے اور فقروں کو احمد علی اور رشید جہاں نے اردو افسانے میں برتا۔ ان متوسط گھرانوں کے مرقعے اردو میں بالکل پہلی بار ان ہی کی زبان میں کھنچے۔ ''انگارے'' کی سب سے اہم ترین افسانہ نگار خاتون رشید جہاں ہیں۔ رشید جہاں پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھیں۔ انہوں نے اردو افسانہ نگاری کو ایک نئی سمت اور جہت دی۔ رشید جہاں سے قبل اردو افسانہ نگاری کے میدان میں جو خواتین افسانہ نگار موجود تھیں وہ نذر سجاد، حجاب اسمٰعیل اور طاہرہ دیوی شیرازی وغیرہ تھیں۔ لیکن ساری خواتین رومان کی تحیر زدہ وادیوں میں بھٹکتی رہیں۔ رشید جہاں نے حقیقت پسندی کا راستہ اختیار کیا۔ ''انگارے'' میں رشید جہاں کا ایک ڈراما اور ایک افسانہ ''دلی کی سیر'' شامل تھا بعض فنی خامیوں کے باوجود اس افسانے میں حقیقت نگاری ایک نئی چیز تھی جس سے اردو افسانہ ناواقف تھا۔ اس افسانے میں بالکل پہلی بار عورت کی آزادی کا سوال اٹھایا گیا تھا اور یہ سوال ایک عورت نے اٹھایا تھا۔

۱۹۳۷ء میں رشید جہاں کے افسانوں کا مجموعہ ''عورت اور دوسرے افسانے'' کے نام سے شائع ہوا۔ ان افسانوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے عورت کے مسائل کو ان کی سماجی، معاشرتی اور مذہبی تناظر میں خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا۔ ان کے افسانوں میں مسلمانوں کے متوسط طبقے کی عورتوں کی زندگی کی حقیقی عکاسی ملتی ہے رشید جہاں بطور عورت ان کے دکھ درد ان کی بے بسی ان کی مظلومیت ان کی محرومی کو محسوس کیا۔ ان افسانوں میں شدید احتجاج نظر آتا ہے۔ رشید جہاں نے مرد کی تحکمانہ برتری اور

اقتدار پسند رویے کی نفسیات کا تجزیہ کر کے معاشرے کے اس ناسور کو کریدنے کی کوشش کی جس کا احساس خود عورت کو نہیں تھا وہ تو اپنی بے بسی دلا چاری کو مقدر کا نام دے کر صابر و شاکر تھی۔ اپنی معاشی زبوں حالی کو قدرت کی عطا اور اچھے و برے شوہر کی دستگیری کو اپنا تحفظ خیال کرتی تھی۔

رشید جہاں کا سیاسی و سماجی شعور بیدار تھا ان کے کرداروں میں زندگی، عمل و حرکت اور جدو جہد ہے۔ وہ آزادانہ طور پر زندگی گذارنے اور عورت کے وجود کو تسلیم کروانے کی متمنی ہیں۔ رشید جہاں کے افسانوں کی عورت روتی منہ بسورتی نہیں ہے اور نہ وہ کوئی حسین بت ہے وہ مرد کی محتاجی و غلامی قبول کرنے والی کمزور و مجبور ہستی نہیں ہے بلکہ بے حد سمجھدار باشعور اور باعمل عورت ہے جو مرد کے استحصال کو سمجھتی ہے اور اپنے آپ پر اعتماد رکھتی ہے۔

ہاجرہ بیگم اپنے مضمون ''کچھ رشید جہاں کے بارے میں'' لکھتی ہیں وہ پہلی اردو کی افسانہ نگار تھی جنھوں نے دلیرانہ طریقہ سے سماج کے ان پہلوؤں کو عیاں کر دیا جن کو ڈھکا چھپا کر رکھا جاتا تھا یہ پہلی مصنفہ تھیں جنھوں نے ایک باغی دل اور دماغ رکھنے والی عورت کی تصویر پیش کی جس کو زندگی بھلے ہی شکست دے سکتی ہو اس کی روح اور ہمت آخری دم تک شکست نہیں مانتی۔''[1]

رشید جہاں ابتدا ہی سے باغیانہ ذہن کی نمائندہ تھیں عورت اور اس کی ذہنی پسماندگی، شکست خوردگی اور بے بسی کے احساس کو انھوں نے تقریباً ہر افسانے اور ڈرامے میں پیش کیا۔ وہ اقتصادی مسائل کو برتنے کے علاوہ مرجہ اخلاقیات پر وار کرتی ہیں۔ وہ مذہبی و سماجی اصول جسے مردوں نے مرضی کے مطابق ڈھال لیا ہے سخت احتجاج کرتی ہیں۔ افسانہ ''عورت'' میں ان کا احتجاج شدید تر ہے وہ مرجہ مردانہ معاشرے کے خلاف چیخ اٹھتی ہیں۔ ''مرد جو چاہے کر سکتا ہے کیوں کہ وہ مرد ہے قانون اس کا بنایا ہوا ہے۔ اخلاق کے اصول اس نے تراشے وہ چاہے تو چار

---

[1] ہاجرہ بیگم۔ عورت اور دوسرے افسانے۔ ۱۹۷۷ء ص۔۸

شادیاں کرسکتا ہے اور اگر عورت اس کے خلاف آواز بلند کرے تو وہ قابل گردن زنی ہے۔ اسے احتجاج کا حق نہیں ہے۔''[1]

رشید جہاں نے سب سے پہلے سادہ گھریلو عورتوں کی بول چال کی زبان کا بھرپور تخلیقی اظہار اپنے افسانوں میں کیا۔ ''آصف جہاں کی بہو''، ''افطاری''، ''چھدا کی ماں''، ''وہ''، ''مجرم کون'' اسی نوعیت کے افسانے ہیں۔ ''بے زبان'' اور ''ساس اور بہو'' میں انہوں نے مسلم متوسط طبقے کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔ اس ایک چراغ سے کئی چراغ روشن ہوئے خواتین افسانہ نگاران سے بے حد متاثر ہوئیں۔ خاص طور پر عصمت چغتائی ان سے بے حد متاثر تھیں۔ وہ لکھتی ہیں:

> ''اور پھر میرا حسین ڈاکٹر ہیرو، شمعی انگلیاں، نارنگی کے شگوفے اور قرمزی لبادے چھو ہو گئے مٹی سے بنی رشیدہ آپا نے سنگ مرمر کے سارے بت منہدم کر دیے۔
>
> زندگی ننگی چم سامنے آکر کھڑی ہو گئی — ان سے گھنٹوں باتیں کر کے بھی جی سیر نہ ہوتا جی چاہتا انہیں کھا جاؤں کیا کروں۔ جو رشید آپا سے مل چکے ہیں انہیں اچھی طرح جانتے ہیں اگر وہ میری کہانیوں کی ہیروین سے ملیں تو دونوں جڑواں نہیں نظر آئیں۔'' [2]

اس طرح بعد کی تمام خواتین نے جرأت اور ہمت کے ساتھ عورت کی بے بسی پر احتجاج کرنا رشید جہاں سے سیکھا۔

☆☆

---

[1] رشید جہاں۔ عورت ''عورت اور دوسرے افسانے''

[2] عصمت چغتائی۔ ''شخصیات اور واقعات جنہوں نے مجھے متاثر کیا'' ص۔۲۱۱

چھٹا باب

عصمت چغتائی کے ناولوں میں نسائی حسیت

عصمت چغتائی نے اپنی ادبی زندگی میں جملہ آٹھ ناول ایک ناولٹ لکھے۔

۱۔ضدی ۲۔ٹیڑھی لکیر ۳۔معصومہ ۴۔سودائی (فلم بزدل) ۵۔جنگلی کبوتر ۶۔دل کی دنیا ۷۔عجیب آدمی ۸۔ایک قطرۂ خون ۹۔باندی (ناولٹ)

'ضدی' عصمت کا پہلا ناول ہے۔ جس کے بارے میں وہ خود اعتراف کرتی ہیں کہ انہوں نے یہ ناول کئی فلموں سے متاثر ہو کر لکھا۔ وہ کہتی ہیں "اس ناول کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ یہ ناول میں نے چار پانچ لڑکیوں کے ساتھ مل کے لکھا" پہلے نوٹس لکھے۔ انہیں ڈسکس کیا۔ ہم اس زمانے میں 'اکرنینا'، 'دیوداس' اور ایک اور کتاب سے متاثر ہوئے تھے۔ سوچا لاؤ فلم کے لئے ایک کہانی لکھیں اور پیسہ کمائیں۔ چنانچہ ہم پانچ لڑکیوں نے جس میں میری کزن اور دوست شامل تھیں، وہ کہانی بنائی اور محسن عبداللہ کو جو اس زمانے میں بمبئی ٹاکیز میں نوکر تھے روانہ کر دی۔ انہیں کہانی ناپسند ہوئی تب ہم نے شاہد احمد دہلوی کو لکھا انہوں نے کہانی کو ناول کی شکل میں لکھنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ میں نے تین چار دن کے اندر

اسے ناول کی شکل میں لکھ دیا'' [1]

یہ ناول عصمت چغتائی نے غیر سنجیدگی سے لکھا۔ کئی لڑکیوں کے مشورے سے لکھا اور فلم کے لئے لکھا، پیسہ کمانے کی خاطر لکھا۔ یہ سب ایسی باتیں ہیں جس کی وجہ سے کوئی تخلیق فن کی کسوٹی پر اعلیٰ درجہ حاصل نہیں کر سکتی۔ اس میں نہ تیکنک کا کوئی تجربہ ہے اور وہ نفسیاتی تجزیہ جو عصمت کا فن کہلاتا ہے۔ اس میں عصمت نے متوسط مسلم گھرانے کے مسائل کو بھی موضوع نہیں بنایا جس کا انہیں گہرا ادرک ہے۔ یہ ناول فلمی انداز میں لکھا گیا اس لئے اس میں ڈرامائیت زیادہ ہے۔ انہوں نے ناول کے سولہ عنوانات قائم کیے ہر عنوان کسی نہ کسی کا تعارف ہے یا آنے والے واقعات کی پیشن گوئی ہے۔ ایسا لگتا ہے ہے انہوں نے ایک ایک کردار کی تفصیلات اکٹھا کرلیں پھر انہیں واقعات کی لڑی میں پرو دیا۔ اس ناول میں وہ اقتصادی کشمکش، طبقاتی فرق کو واضح کرنے میں بھی پوری طرح کامیاب نہ ہو سکیں۔ ''ضدی'' کی کہانی بہت ہی مختصر ہے۔ یہ کہانی ڈرامائی انداز میں آشا کی نانی جو راجہ صاحب کی کھلائی رہ چکی ہے اس کی موت سے شروع ہوتی ہے۔ مرنے سے قبل آشا کی نانی کو پورن کا انتظار ہے جو راجہ صاحب کا چھوٹا لڑکا ہے۔ وہ ہر اتوار کو بڈھیا کی مزاج پرسی کرنے آتا ہے۔ مرنے سے قبل وہ آشا کو پورن کے حوالے کرتی ہے کہ وہ اسے راجہ صاب کے چرنوں میں پہنچا دے۔ راجہ صاحب کے گھر میں آشا دوسری ملازماؤں کے ساتھ کام کاج میں جٹ جاتی ہے۔ اس محل میں راجہ صاحب ہیں ان کی بیوہ ہے۔ بھابی ہے جس کے تین خوبصورت بچے ہیں اس کا شوہر اروپ ہے جو محل کے کاروبار کی دیکھ بھال کرتا ہے اور پورن ہے جو عصمت کے اس دور کے ہیرو کی طرح خوش شکل، ذہین، کھلنڈرا اور چرب زبان ہے۔ اتنی جائیداد ہے کہ بیٹھ کر سات پیڑیاں مزے سے کھا سکیں۔ پورن سارا دن بھابی کو تنگ کرتا ہے بچوں کو چھیڑتا ہے۔ بڑے بھیا پر جملے کستا ہے۔ نوکروں کو تک نہیں بخشتا، چمکی سے لے کر بوڑھی بھولا کی تائی تک سب اس کا نشانہ بنتے ہیں۔ پورن آشا سے محبت

---

[1] شخصی انٹرویو: عصمت چغتائی سے ایک ملاقات۔ شاعر شمارہ ۳۔ یونس اگاسکر: ۱۹۷۶

کرنے لگتا ہے۔ آشا کو اپنی حیثیت کا اندازہ ہے لیکن پورن اس کے لئے سب کچھ ٹھکرانے تیار ہے۔ گھر والوں کو جب آشا اور پورن کے عشق کا پتہ چلتا ہے تو وہ پورن کو طبقاتی فرق سمجھاتے ہیں۔ آشا کو پورن کی بہن کملا کے گھر بھیج دیتے ہیں اور کملا کی نند شانتا سے پورن کی شادی کر دیتے ہیں آشا کے بارے میں پورن کو بتایا جاتا ہے کہ وہ طاعون کا شکار ہو کر مر گئی۔ آشا کے بچھڑ جانے کے بعد پورن کو زندگی سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی گھر والوں کے شدید اصرار پر وہ شانتا سے شادی کر لیتا ہے۔ شادی کے دن آشا بارات دیکھنے آتی ہے شادی کے پنڈال کو آگ لگ جاتی ہے۔ اس افراتفری میں پورن آشا کی ایک جھلک دیکھ لیتا ہے اور اسے آشا کی روح سمجھتا ہے۔ کملا کی سسرال کا ایک فرد شیام لال جو آشا پر بری نظر رکھتا ہے آشا کہتا ہے کہ وہ کہیں دور چلی جائے کیوں کہ پورن اور شانتا کی شادی ہو چکی ہے۔ پورن احتجاج کا نیا طریقہ اختیار کرتا ہے وہ شانتا میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔ شانتا اسے راغب کرنے کی ساری کوششیں کر کے تھک جاتی ہے اور مہیش میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔ ایک روز وہ مہیش کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ پورن دق کا شکار ہو جاتا ہے۔ اروپ شانتا کو اس کے گاؤں سے بلا لاتا ہے۔ جب آشا پورن کے پاس پہنچتی ہے تو وہ زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے۔ وہ آشا کو سینے سے لگائے مر جاتا ہے۔ آشا سینے پر مالش کرنے کے تیل کی پوری شیشی پی جاتی ہے۔ پھر تیل چھڑک کر چاروں طرف آگ لگا دیتی ہے اس طرح دونوں مر جاتے ہیں۔

عصمت کے اس ناول میں نسائی حسیت کی تلاش بے معنیٰ ہے۔ پورا ناول ڈرامائی واقعات سے بھر پور ہے۔ واقعات کہانی کی زمین سے نہیں پھوٹتے بلکہ لادے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے یہ نذر سجاد حیدر یا حجاب اسمٰعیل کا ناول ہے جس میں کردار حالات سے گھبرا کر خودکشی کر لیتے ہیں۔

پورن عصمت کے ابتدائی افسانوں کے ہیرو کی طرح گھر بھر کا لاڈلا شریر، شوخ چرب زبان ہے لیکن داستانی شہزادوں کی طرح بے عمل ہے وہ اپنے بزرگوں کے آگے آشا

سے محبت کا اقرار تو کرتا ہے لیکن اپنی محبت کو پانے کوئی عملی جدوجہد نہیں کرتا۔ آشا کی موت پر یقین کر لیتا ہے اسے کہیں تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ آشا کو اس کی بہن کے گھر میں رکھا جاتا ہے لیکن اسے پتہ نہیں ہوتا۔ آشا کی موت کی خبر کی تصدیق کرنے گاؤں نہیں جاتا۔ اپنی منزل پانے کے لئے کسی راہ کا انتخاب کرنے کے بجائے حالات کے آگے سپر ڈال کر بیمار ہو جاتا ہے۔ زندگی سے دلچسپی لینا چھوڑ دیتا ہے۔ بزرگوں کے کہنے پر شادی کے لئے راضی ہو جاتا ہے اور شانتا کی زندگی تباہ کر دیتا ہے۔ آشا سے شادی کے دن اتفاقیہ ملاقات ہوتی ہے تو اسے روح سمجھ لیتا ہے۔ ایک پڑھے لکھے بیسویں صدی کے نوجوان کا اس طرح سوچنا بعید از قیاس ہے۔ اس کی بیوی دوسرے نوجوان کے ساتھ بھاگ جاتی ہے تو خوش ہوتا ہے کہ اس طرح اس کے خاندان کی ناک کٹ گئی جس کی دہائی دے کر انہوں نے آشا سے شادی کرنے سے منع کیا تھا۔ اور آخر میں دق کا شکار ہو کر مر جاتا ہے۔ پورن کے اس انداز کے بارے میں عصمت کہتی ہیں ''ضدی میں پُورن کی بغاوت کا وہ انداز ہے جو گھر میں سب سے چھوٹے لڑکے کا ہوتا ہے بڑا ہوتا تو فیصلے کرتا۔ لیکن وہ ستیاگرہ کرتا ہے گاندھی جی کی پالیسی اختیار کرتا ہے اور وہ بڑی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔'' [۱]

گاندھی جی نے ستیہ گرہ کی تھی اور عدم تشدد کا راستہ اختیار کیا تھا تو ایک مقصد کی خاطر۔ اور انہوں نے اپنا مقصد پانے اور طاقتور مخالف کو جھکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آشا کی موت کی خبر سننے کے بعد آخر کس مقصد کے تحت پورن ستیہ گرہ کی؟۔ کچھ حاصل کرنے کے بجائے وہ خود ہی فنا ہو گیا۔ اس لئے اس کا عشق بڑا مریضانہ لگتا ہے۔

اس ناول میں وہ عصمت کہیں نظر نہیں آتیں جو سماج کو اپنی نظر سے دیکھتی ہیں۔ اس لئے ان کی نسائی حسیت لاشعور میں کہیں اونگھتی نظر آتی ہے اس پدرانہ سماج سے انہیں کوئی شکایت نہیں ہے۔ عورت اپنی حیثیت اور رتبے سے خوش ہے۔ اس سماج کے خلاف وہ سوچتی تک نہیں بغاوت کرنا تو دور رہا۔ کہانی کی ہیروین آشا بالکل ایسے ہی خوفزدہ رہتی ہے

---

[۱] شخصی انٹرویو۔ یونس اگاسکر۔ عصمت چغتائی سے ایک انٹرویو۔ شاعر شمارہ ۳۔ ۱۹۶۷۔ ص ۵

جیسے انارکلی، سلیم سے محبت کرنے کے بعد ہمیشہ ڈری سہمی اور خوفزدہ رہتی تھی۔ آشا کا کردار مجہول، بے عمل اور تقدیر پر شاکر ہے۔

وہ چابی بھری گڑیا کی طرح اشاروں پر ناچتی ہے۔ اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں۔ شادی کے دن پورن سے اس کی ملاقات ہوتی ہے تو اس کی زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ شیام لال اسے بھاگ جانے کو کہتا ہے تو بھاگ جاتی ہے۔ اروپ اسے بلا لیتا ہے تو وہ واپس آجاتی ہے۔ اس کے کسی عمل میں اس کی اپنی مرضی کا دخل نہیں ہے۔ عصمت لکھتی ہیں۔

''مجھے روتی بسورتی حرام کے بچے جنتی ماتم کرتی نسوانیت سے ہمیشہ سے نفرت تھی۔ خواہ مخواہ کی وفا اور وہ جملہ خوبیاں جو مشرقی عورت کا زیور سمجھی جاتی ہیں مجھے لعنت معلوم ہوتی ہیں۔ جذباتیت سے مجھے سخت کوفت ہوتی ہے۔ عشق قطعی وہ آگ نہیں جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے۔ عشق میں محبوب کی جان کو لاگو ہو جانا۔ خودکشی کرنا واویلا کرنا میرے مذہب میں جائز نہیں۔ عشق مقوی دل و دماغ ہے نہ کہ جی کا روگ'' [1]

لیکن ضدی میں وہ اپنے ان خیالات کی نفی کرتی نظر آتی ہیں اس میں آشا روتی بسورتی لڑکی ہے۔ پورن اور آشا خودکشی کر لیتے ہیں۔ عشق دن کی جان کو لاگو ہو جاتا ہے۔ عشق کی کیفیات مرد اور عورت پر مختلف اثر ہوتا دکھاتی ہیں۔ اس ناول میں ان کی عورت مجبور اور ناقص العقل ہے۔

انسان محبت میں ہر وقت چلبلاپن کیوں کرتا ہے من کے ساتھ ساتھ ہاتھ پیر اور آنکھیں کیوں مست ہو کر ناچنے لگتی ہیں؟ اور ہر چیز ہنسنے ہنسانے کے لئے ہی نظر آتی ہے اور سنجیدگی کہاں ڈوب مرتی ہے کہ ذرا بھی کل کا دھیان نہیں آتا۔ مگر عورت؟ وہ کتنی مختلف ہوتی ہے اس کا دل ہر وقت سہما ہوا رہتا ہے۔ ہنستی ہے تو ڈر کے، مسکراتی ہے تو جھجک کر۔ قدم قدم پر اسے اپنے راز کے ہی کھلنے کا ڈر لگا رہتا ہے۔ کیا ہوگا؟ کیسے ہوگا؟ یہ ہوا تو؟ وہ ہوا تو؟۔

---

[1] عصمت چغتائی۔ شخصیت اور واقعات جنھوں نے مجھے متاثر کیا۔ ص ۲۱۲

اور پھر کم بخت ناقص العقل۔!'' [1]

صرف شانتا کے کردار میں عصمت کی نسائی حسیت کے کچھ بھم اشارے ملتے ہیں۔شانتا کی بے راہ روی کا وہ نفسیاتی تجزیہ کرتی ہیں۔

''شانتا کے سامنے بھی دو راستے تھے ایک تو وہی راستہ تھا جس پر وہ چل رہی تھی پتی ورتا ہندوستانی بیوی بن کر جگ کی لاڈلی نیک اور پارسا جہاں وہ مٹی کے ڈھیلے کی طرح لڑھک رہی تھی۔اس سے بھی بدتر مٹی کے ڈھیلے سے بھی کبھی کوئی گھاس پھوس کا تنکا تو اُگ آتا ہے وہ بھی کبھی کسی معرف میں آجاتا ہے۔مگر وہ تو کچھ اور ہی تھی۔اس ٹھنڈی چتا میں سال سے اوپر اسے جھلستے ہوگیا۔کاش پورن کی طرح اسے بھی کوئی روگ لگ جاتا۔مگر روگ اسے لگا ہوا تھا۔پر یہ کیسا روگ تھا جو اس کے من کو ہر وقت گدگداتا رہتا اور دن بدن اس کا جسم زیادہ لچکدار اور آنکھیں زیادہ باتونی ہوتی جارہی تھیں۔کیوں مہیش کے مضبوط جسم کو دیکھ کر اسے ہلکے ہلکے زلزلے جیسے ہلکورے محسوس ہونے لگتے ہیں۔کیوں جی کہتا تھا کہ وہ گوشت پوست کا بھاری بھرکم انجن اس کی ہستی کو پیس رہا ہے۔ [2]

شانتا اپنی مرضی سے انقلابی قدم اٹھاتی ہے وہ بے حس اور اسے نظر انداز کرنے والے شوہر کے مقابلے میں اپنے چاہنے والے کا انتخاب کرتی ہے۔جو شادی شدہ ہے۔ عصمت پاک محبت کو نہیں مانتیں وہ محبت اور جنس کو لازم وملزوم سمجھتی ہیں۔اس ایک کردار کے علاوہ سارے کردار مردانہ سماج میں خوش نظر آتے ہیں جن میں سے ایک بھابی ہے جو ساس کا کہنا مانتی ہے سارے گھر کی لاڈلی ہے اپنے دیور سے لڑتی جھگڑتی ہے یہ لڑائی پیار بھری ہوتی ہے لیکن وہ آشا اور پورن کی محبت کے درد کو نہیں سمجھ سکتی۔وہ آشا کی ہمدرد نہیں ہے۔ حالانکہ اسے بہت پسند کرتی ہے۔اس کی ہمدردی اس گھر کے کھوکھلے اصولوں سے ہے۔

عصمت کے اس ناول میں نسائی حسیت کا اظہار نظر نہیں آتا۔یہ ایک معمولی اور

---

[1] ضدی۔ ص۔۵۹

[2] ضدی۔کتابستان،الہ آباد۔ ص۔۱۵۶

غیر اہم ناول ہے۔

ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی کا سب سے اہم ناول ہے۔ یہ ان کا دوسرا ناول ہے جو ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ اردو کا یہ اولین ناول ہے جس میں ایک عورت نے سماج کو اپنی نظر سے دیکھا اور اپنے ذہن سے سوچا۔ اور بے لاگ ردّ عمل کا اظہار کیا۔ عصمت نے عورت کو مروجہ سماج کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی اور نہ اصلاح نسواں یا بیداری نسواں کی تحریک کے زیر اثر یہ ناول لکھا۔ اپنی نسائی حسیت کی مدد سے عصمت نے اس سماج پر بھرپور طنز کیا جس کی باگ ڈور مرد کے ہاتھ میں ہے جہاں عورت کو مرد سے کمتر، کمزور اور ناقص العقل سمجھا جاتا ہے۔ ساتھ ساتھ انہوں نے عورت کی ان کمزوریوں پر بھی بے رحمانہ تنقید کی جس کا استحصال مردانہ سماج میں ہوتا ہے۔

یہ ناول سوانحی انداز میں لکھا گیا جو عصمت کی پسندیدہ تکنیک ہے ان کے بیشتر ناول اور افسانوں کے لئے انہوں نے صیغۂ واحد متکلم حاضر کا ذریعہ اختیار کیا۔ فضیل جعفری کے بیان کے مطابق John E. Tilford Ir نے اپنے نقطہ نظر پر ایک مبسوط مقالے میں لکھا ہے کہ صیغۂ واحد متکلم حاضر والا نقطۂ نظر افسانے میں خودنوشت کا تاثر اور عنصر پیدا کر دیتا ہے اور بظاہر ناقابلِ یقین باتیں بھی قاری کے لئے قابل یقین بن جاتی ہیں [۱]

یہ بات ٹیڑھی لکیر پر پوری طرح صادق آتی ہے۔

ٹیڑھی لکیر کے مرکزی کردار شمن کے پردے میں خود عصمت چھپی نظر آتی ہیں۔ خود عصمت نے اس کا اعتراف کیا وہ کہتی ہیں ''اس ناول کی ہیروین قریب قریب میں ہوں بہت سی باتیں اس میں میری ہیں۔ ویسے آٹھ دس لڑکیوں کو میں نے اس کردار میں جمع کیا ہے اور ایک لڑکی کو اوپر ڈال دیا۔[۲]

ناول میں شمن کا کردار مختلف رنگ بدلتا نظر آتا ہے خصوصیت سے ناول کا آخری

---

[۱] فضیل جعفری   عصمت چغتائی کا فن مشمولہ اردو افسانہ روایت اور مسائل   ص ۴۲۸

[۲] یونس اگاسکر۔   عصمت چغتائی سے ایک ملاقات: شاعر شمارہ ۳۔   ۱۹۷۶ء   ص ۱۵

حصہ اس کے دوسرے حصوں سے میل نہیں کھاتا۔ احسن فاروقی لکھتے ہیں ''اس ناول کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس کا وہ سحر جو شروع سے جاری طاری اور ساری تھا۔ شمن کی امریکن سے شادی کے بعد اک دم ٹوٹ جاتا ہے........ ناول کا آخری حصہ اتنا ہی پوچ اور قلم زد کردینے کے لائق ہے، جب کہ شروع سے یہاں تک کا حصہ اعلیٰ پایہ کا اور قائم رہنے والا ہے۔ [1]

عصمت کا یہ ناول اردو کا پہلا ناول ہے جس میں نسائی حسیت کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ ایک لڑکی کے عورت بننے تک کے سارے مراحل اس میں موجود ہے اور یہ لڑکی اپنے نقطۂ نظر سے سماج کو دیکھتی ہے۔ یہ لڑکی یہ بھی سوچتی ہے کہ مرد اس سماج میں عورت کے مسائل کو اس انداز میں دیکھتا ہے۔۔۔

عصمت نے اس ناول میں مختلف نسوائی مسائل کو برتا ہے۔ جو اس دور کے مسائل تھے۔ نوجوان بیوہ کا مسئلہ، کچی عمر کی لڑکیوں میں ہم جنس پرستی کا رجحان، بورڈنگ کی مخصوص زندگی، کنواری ماں اور ناجائز بچے کی سماج میں حیثیت کا مسئلہ، نکاح کی اہمیت اور حقیقت — گھریلو زندگی کی گھٹن، جنسی کجروی۔ لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ، خارجی دنیا میں عورت کی حیثیت، پردے کا مسئلہ، اسکولوں میں ملازم معلماؤں کا مسئلہ، آزاد خیال فلرٹ کرنے والی لڑکیوں کا مسئلہ فیشن پرست ترقی پسندوں کا مسئلہ، بے جوڑ شادیوں کا انجام، جنگ کا خون اور ہولناکیاں — اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے جنسی اور نفسیاتی مسائل اور گتھیاں ان سب کو عصمت نے عورت کی حیثیت سے دیکھا اور اپنے نقطۂ نظر کو پیش کیا۔ عصمت نے اس ناول کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ پہلی منزل، دوسری منزل اور تیسری منزل۔ پہلی منزل میں شمن کا بچپن اور گھریلو زندگی ہے۔ دوسری منزل میں جوانی کا ابتدائی دور اور اسکول، بورڈنگ کی زندگی ہے۔ تیسری منزل میں شعور کو پہنچی ہوئی شمن اور خارجی دنیا سے اس کا ٹکراؤ اور وسیع دنیا ہے۔

---

[1] احسن فاروقی۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ ص۔ ۲۳۰۔۲۳۱

شمن کی زندگی میں ماں اور باپ کی کوئی اہمیت نہیں ماں کا کام صرف بچے پیدا کرنا ہے اور باپ کو بچوں سے زیادہ بیوی کی ضرورت لاحق ہے وہ ماں باپ رکھتے ہوئے بھی یتیم جیسی ہے۔ وہ سب سے زیادہ اپنی بہن منجھو کو پیار کرتی ہے اس کی شادی کے بعد بالکل اکیلی ہو جاتی ہے۔ شمن کے گھر میں آپا بیوہ ہو کر آتی ہیں اور وہی اس کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان کے دو سدھے ہوئے بچے ہیں جن کے مقابلے میں وہ شمن کو ذلیل کرتی رہتی ہیں۔ شمن اسکول اور وہاں سے کالج میں پڑھتی ہے۔ تعلیمی اداروں کی حالت دیکھتی ہے۔ اس سے اثر قبول کرتی ہے۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد گھر آتی ہے اور ماں باپ کے گھر میں خود کو یتیم پا کر ایک سکول میں نوکری کر لیتی ہے۔ وہ ادبی اور تعلیمی انجمنوں کی زندگی دیکھتی ہے۔ اپنی بے اطمینانی کو ختم کرنے کے لئے وہ ایک لڑکی پالتی ہے لیکن پرائی لڑکی اس کی نہیں ہو سکتی۔ ایک ترقی پسند نوجوان سے عشق کرتی ہے جو مدقوق ہے اور آخر میں پتہ چلتا ہے کہ وہ شادی شدہ ہے۔ آخر میں وہ ایک امریکن سے شادی کر لیتی ہے۔ مگر سماج دونوں کو قبول نہیں کرتا دونوں دن رات جھگڑتے رہتے ہیں آخر تنگ آ کر وہ امریکن لڑائی پر چلا جاتا ہے شمن ماں بننے والی ہے۔ ماں بننے کی خوشی اور شوہر کے انتظار پر ناول ختم ہوتا ہے۔

ناول کے پہلے حصے میں عصمت نے بیوہ کا مسئلہ پیش کیا۔ یہ بیوہ نذیر احمد، راشد الخیری اور پریم چند کی بیوہ سے بالکل مختلف ہے۔ عصمت نے اس مسئلہ کو نذیر احمد کی طرح اصلاحی رنگ میں پیش کیا اور نہ پریم چند کی طرح بیوہ کو آشرم میں پناہ دی نہ راشد الخیری کی طرح بیوہ کو دنیا کی مظلوم ترین عورت بنایا۔ یہ بیوہ مسلم معاشرے کی جیتی جاگتی عورت ہے۔ یہ بیوہ مظلوم بھی ہے اور ظالم بھی۔ مذہب اسے دوسری شادی کی اجازت دیتا ہے لیکن جس طبقے سے اس کا تعلق ہے وہاں کنواری لڑکیوں کا بیاہ ایک مسئلہ ہے بیوہ کو کوئی نہیں پوچھتا۔ پھر جس معاشرے سے اس کا تعلق ہے اس میں بیوہ کی شادی کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس کے سامنے ایک طویل عمر ہے۔ وہ اپنی بیوگی سے خوب فائدہ اٹھاتی ہے۔ سماج نے جتنی اجازت اور آزادی دی ہے وہ اس کا خوب استعمال کرتی ہے وہ سماج کی

قدروں کو اس کے منہ پر کھینچ مارتی ہے سماج نے اس کی خوشیوں پر پابندی لگا دی ہے وہ بدلے میں کسی کو خوش ہونے نہیں دیتی سماج اسے سجنے سنورنے نہیں دیتا وہ سادگی اور سجاوٹ کا اہتمام کر لیتی ہے لوگ یتیم بچوں کو قابل رحم سمجھتے ہیں وہ اس رحم کی دہائی دے کر ہر رعایت حاصل کر لیتی ہے معاشرے کی اس تضاد نے اس کے اندر مکر وفریب بھر دیا ہے دوسروں کو ذلیل کر کے وہ خوش ہوتی ہے عصمت اس بیوہ کی تصویر کشی اس طرح کرتی ہیں

''اس کے سفید کپڑوں میں بھی وہ رنگینیاں ہوتیں کہ کھل اٹھتی ایک دفعہ تو نئی دلہن کا سہاگ کا جوڑا ماند پڑ جاتا سفید، کریب یا شفان کا دوپٹہ جس پر بچاری بیوہ نازک سی بیل چپکا لیتی، سفید چکن کارگے کا کرتہ، سارا گلہ مہین مہین بیلوں اور ریشمی ڈوریوں سے آراستہ، قدم قدم پر ستاروں کے جال اور موتیوں کے پھندنے ۔۔۔۔ مانگ کی تو بچاری کو اجازت نہ تھی ویسے کون روکتا تھا ہر اس کا اپنا دل ہی مردہ ہو گیا تھا۔ اس لئے بال اوپر چڑھا کر پھولے پھولے گچھے کانوں پر چھوڑ دیتی ۱ؔ

اس سادگی میں سجاوٹ اور اہتمام چھپا ہے وہ ضائع نہیں جاتا۔ لوگ آپا کو 'کنواری' سمجھ لیتے ہیں اس بات پر وہ زندگی بھر فخر کرتی ہیں۔ وہ اپنی لڑکی نوری کی تربیت پر پوری طرح دھیان دیتی ہے۔ اس کی لڑکی کسی بھی مہمان کی گود میں بیٹھ جاتی ہے انگریزی انسانی اعضا کے نام بتاتی ہے۔ وہ ہر وقت نوری کے مقابلے میں شمن کو ذلیل کرتی ہے۔ نوری اور آپا کی زندگی دیکھ کر شمن کے معصوم ذہن میں یہ خواہش جاگتی ہے کہ کاش وہ بھی یتیم ہوتی۔ وہ دعائیں مانگتی ہے کہ اس کے ماں باپ بھی مر جائیں۔ عصمت نے بڑے نازک مسئلے کو چھیڑا ہے۔ یہ بیوہ سب سے مختلف ہے۔ وہ گھر پر راج کرتی ہے۔ 'آپا' کو شدید احساس ہے کہ وہ اپنے نفس کو مار کے باپ کی عزت سمیٹے بیٹھی ہے۔ جیسے سارے گھر پر احسان کر رہی ہو۔ وہ اپنی نسوانیت کا خون کر رہی ہے۔ اس طرح اس میں حکومت کرنے کی طاقت بڑھتی جاتی ہے۔ عصمت نے ایک ایسے رُخ سے اس مسئلے کو دیکھا جہاں ان کی نسائی

۱ؔ ٹیڑھی لکیر ص ۵۷۔۵۸

حسیت نے ان نئے گوشوں کو محسوس کیا۔ جس پر کسی کی نظر نہیں گئی تھی۔ لیکن کیا واقعی یہ بیوہ قابل نفرت ہے؟ نہیں کیوں کہ عصمت کا یہ کردار راؤنڈ Round ہے۔ عصمت اس کا دوسرا رخ بھی دکھاتی ہیں۔ یہ عورت 'آپا' نے صرف تین برس اپنے شوہر کے ساتھ گزارے تھے۔ ان تین برسوں میں بھی اسے اپنی ساس کے اعتراضات اور طعنے سننے کو ملے تھے بڑھیا کا اکلوتا لڑکا ہے۔ وہ اس پر دیوانی ہے۔ جب بھی لڑکا بیوی کی طرف راغب ہوتا ہے۔ وہ جل جاتی ہے۔ اس نے ایسا ماحول بنا رکھا ہے کہ بیٹا اپنی بیوی سے ملنے کو ترس جاتا ہے جیسے وہ اس کی جائز بیوی نہیں پرائی عورت ہو۔ 'آپا' یہ سوچ کر صبر کر لیتی ہے کہ بڑھیا کچھ دنوں بعد مر کھپ جائے گی۔ لیکن اس کے برعکس شوہر ختم ہو جاتا ہے اور بڑھیا زندہ رہ جاتی ہے۔ ان حالات نے اس کے اندر تلخی بھر دی ہے۔ دبی کچلی عورت آرزوں کے مقتل سجائے اپنے گھر آتی ہے اور پورے گھر پر حکم چلانے لگتی ہے۔ جس پر اس کا سب سے زیادہ اختیار چلتا ہے وہ شمن ہے۔ اپنی بیٹی کے مقابلے میں شمن کو ذلیل کر کے اسے تسکین ملتی ہے جیسے وہ اپنی ''سہاگن'' ماں سے بدلہ لے رہی ہو۔ لیکن یہی آپا فطرت کے خلاف لڑ نہیں سکتی۔ منجھو کی شادی پر ان کو دورے پڑنے لگتے ہیں۔ جنسی تجرد شادی کے واقعہ کی وجہ سے نفسیاتی طور پر ابھر آتا ہے۔ وہ موسیقی سے دل بہلاتی ہے اپنے جذبوں کا رخ موڑنا چاہتی ہے لیکن ناکام رہتی ہے۔ وہ اپنے رشتے کے دیور رشید جو ڈاکٹر ہے کی طرف کھنچتی جاتی ہے۔ اس کے دورے بند ہو جاتے ہیں۔ لیکن گھر والے جو اس کی ہر بات برداشت کرتے ہیں اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے۔ بڑا بھائی رشید کی آمد ورفت بند کر دیتا ہے۔ ساس چوکنا ہو کر پہرے بٹھا دیتی ہے۔

بیوہ کے مسئلے کو عصمت نے ایک عورت کی نظر سے دیکھا ہے کسی خشک نصیحت یا واعظ کے بغیر انہوں نے اپنی نسائی حسیت کی مدد سے سچی تصویر پیش کر دی۔

پہلے حصے میں عصمت نے بڑی سچے اور فطری نظر دکھائے ہیں۔ نوری اور شمن کا گڈا، گڈی کھیل کے دوران مرد اور عورت کے جسمانی فرق کو محسوس کرنا ان میں نسوانیت کا

احساس بیدار ہونا۔ کم سے کم لفظوں میں عصمت اتنی خوبصورتی سے عکاسی کی کہ ان ساری کیفیتوں کو ایک عورت ہی محسوس کر سکتی ہے۔

ممتاز شیریں لکھتی ہیں ''عورت کے جنسی جذبے، جنسی اٹھان اور ارتقاء اور نفسیات کو تو عصمت چغتائی سے بہتر کوئی ترجمان شاذ ہی مل سکے۔ عصمت نے بے باکانہ جرات سے عورت کو پہلی دفعہ اصلی روپ میں پیش کیا تھا''

ممتاز شیریں کے اس خیال کی تائید اس کیفیت کے اظہار سے ہوتی ہے جو عصمت نے کیا۔ شمن بچپن میں جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے وہ بورڈنگ میں اکیلی ہے کوئی ایسا بزرگ نہیں جو اسے تسلی دے سکے۔ ذہن میں اٹھتے سوالوں کا جواب دے۔ ان کیفیات اور محسوسات کی عکاسی ایک خاتون مصنفہ جس عمدگی سے کر سکتی ہے وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ خاتون بھی وہ جس کی نسائی حسیت بہت تیز ہو۔ عصمت اس کیفیت کو اس طرح بیان کرتی ہیں۔ ''کاش کوئی دوا ہوتی جسے کھا کر وہ چوہیا برابر ہو جاتی وہ بہت تیزی سے بڑھ رہی تھی جسم کے مختلف حصے مختلف اوقات میں بڑھ رہے تھے پہلے تو جیسے ٹانگوں جسم سے نفرت ہو گئی وہ بے طرح لمبی ہونے لگیں۔ رات کو محسوس کرتی اس کی ٹانگیں بڑھ رہی ہیں لمبی لکیروں کی طرح لہراتی پلنگ سے اتر کر دیوار پر سے رینگتی ہوئی نامعلوم منزل کی طرف بہہ رہی ہیں وہ جلدی سے کہنی کا سہارا لے کر ٹانگوں کو دیکھتی وہ جھٹ سے کینچوے کی طرح سکڑ جاتیں گویا اس نے انہیں عین وقت پر پکڑ لیا ورنہ بھاگ ہی گئی ہوتیں وہ کنکھیوں سے لیٹ کر دیکھتی کہ اب کر رہی ہیں اس کی ٹانگیں مگر وہ ہوشیار سانپوں کی طرح مکر کئے پڑی رہتیں۔ یہی نہیں اس کے جسم کا ہر حصہ غیر سا ہو چلا تھا۔''[1]

ان تبدیلیوں پر وہ گھنٹوں تنہائی میں آنسو بہاتی ہے۔ خودکشی کے منصوبے بناتی ہے اس بات کا دکھ ہے کہ اس کے جسم پر گوشت جگہ بے جگہ تھپا چلا جا رہا ہے۔۔۔ عصمت نے بلوغت کی اس کیفیت کو ایک نابالغ اور معصوم ذہن کس طرح سے سوچتا ہے اس کی مکمل

---

[1] ٹیڑھی لکیر ص۔۹۰

عکاسی کی ہے۔اس کیفیت سے ناآشنا لڑکی جسم کی تبدیلیوں سے خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ ایسے میں کوئی نہیں جو اسے یہ سمجھائے کہ یہ تبدیلی عین فطری ہے۔ یہ ساری ذہنی کیفیت ایک عورت ہی محسوس کرسکتی ہے۔ناول کا یہ حصہ نسائی حسیت کا مکمل اظہار ہے۔اس اظہار میں ایک کچی عمر کی لڑکی کی معصومیت اور خوف پنہاں ہے۔اس درد کو عصمت نے کس خوبی سے تحریر کیا ہے۔"اس نے بھاگنا دوڑنا کم کردیا تھا۔ جیسے ہوا سے بھی ٹیسیں سی چھبتی تھیں جسم پکا پھوڑا ہو گیا تھا اور پنڈلیوں میں اینٹھن ہوتی تھی۔ بڑی جماعت کی لڑکیوں سے اسے بہت نفرت تھی اور وہ ان کا ہمیشہ مذاق اڑایا کرتی تھی۔ جب رسی کودتے وقت زمین پر پیر پٹختیں۔۔۔۔۔۔[1]

جسمانی اور ذہنی کیفیات کا یہ امتزاج سچے تجربے یا مشاہدے کا نچوڑ ہے جو عصمت کے علاوہ کسی اور فن کار سے ممکن نہیں۔ یہی نسائی حسیّت انہیں دوسری خاتون ناول نگاروں سے ممتاز اور منفرد بناتی ہے۔ شمن اپنے جسم کی تبدیلیوں سے اس قدر خائف ہے کہ ڈاکٹری معائنے کے وقت وہ کپڑے اتارنے سے انکار کردیتی ہے۔اس کے معصوم ذہن میں یہ خیال جکڑ پکڑ لیتا ہے کہ یہ ساری جسمانی تبدیلیاں دراصل ماں بننے کا پیش خیمہ ہیں۔ اس نے اپنی بہن کو ماں بنتے دیکھا تھا اس نے کنواری مریم کے ماں بننے کے قصے سنے تھے وہ نہیں جانتی تھی کہ ماں کیسے بنتی ہے لیکن ایک خوف طاری ہے اس کی روم میٹ سعادت یہ گتھی سلجھاتی ہے۔ایک خاص عمر میں لڑکیوں کو سرپرستوں کی کتنی ضرورت ہوتی ہے اس کا احساس شمن کی ذہنی حالت سے لگایا جاسکتا ہے عصمت کا یہی فن ہے کہ وہ تصویر سامنے رکھ دیتی ہیں خود کچھ نہیں کہتی۔ یہ تصویر اتنی مکمل ہوتی ہے کہ خود ہی بولنے لگتی ہے۔

بورڈنگ کی زندگی میں عصمت نے ایک اور مسئلہ اپنی روایتی جرات اور بے باکی کے ساتھ پیش کیا۔جس سے سب واقف ضرور رہے ہوں گے لیکن اس مسئلے پر قلم اٹھانے کی ہمت اردو ادیبوں نے نہیں کی۔ عصمت کی نسائی حسیت نے اسے محسوس کیا اور وہ اس مسئلے

---

[1] ٹیڑھی لکیر ص۔۹۰

کے اظہار بھی وہ فن کارانہ انداز میں کر گئیں۔ یہ مسئلہ ہے ہم جنس پرستی کے رجحان کا— یہ مسئلہ اتنا ہی پرانا ہے جتنی انسانی تہذیب۔ اس کے اسباب وعلل کے بارے میں بے شمار دلیلیں پیش کی گئی ہیں۔ مغربی دنیا کے فیمنسٹ Feminists اسے قانونی طور پر جائز قرار دینے کا مطالبہ کر رہے ہیں اور اکثر ممالک میں اسے جائز قرار بھی دیا جا چکا ہے۔ بلکہ اب تو ہندوستان میں بھی جائز قرار دے دیا گیا۔

Havelock Ellis نے ۱۸۹۷ء میں اس مسئلے کا جائزہ لیا تھا۔ اس کا خیال ہے کہ یہ رجحان مدارس اور جیلوں میں زیادہ پایا جاتا ہے وہ اس کی نفسیاتی اور سماجی وجوہات بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے "جہاں تک جوان لڑکیوں کا سوال ہے وہ دوسروں کی بھرپور توجہ اور پیار چاہتی ہیں اور سماجی جکڑ بندیاں انہیں لڑکوں جیسی آزادی نہیں دیتیں۔ لڑکیاں لڑکوں کے مقابلے میں اپنے وجود کا بہت زیادہ احساس رکھتی ہیں جو جنسی آزادی لڑکوں کو حاصل ہے وہ انہیں نہیں ملتی وہ اپنے جسم کے بارے میں زیادہ باخبر اور حساس ہوتی ہیں" [1]

اس طرح کا رجحان رکھنے والی لڑکیوں کو وہ دو گروہ میں تقسیم کرتا ہے ایک وہ جن کی شکل وصورت معمولی ہوتی ہے یا پھر وہ بدصورت ہوتی ہیں جن پر ہر آدمی ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر گذر جاتا ہے جن کی شادیاں نہیں ہو پاتیں ایسی لڑکیاں اپنی ہی جنس کی طرف متوجہ ہوتی ہیں۔ دوسری قسم فطری طور پر یہی رجحان رکھنے والی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ انہیں مردوں سے شدید نفرت ہوتی ہے اور خود ان کے وجود میں مردانہ اوصاف ہوتے ہیں ایسی لڑکیاں شدید قسم کا رجحان رکھتی ہیں۔

ضیا عظیم آبادی لکھتے ہیں "جاگیردارانہ نظام میں ہر رئیس زنان بازاری سے لطف اندوز ہو رہا تھا گھر والیاں بستر گل پر کانٹوں کی سیج کی طرح کروٹیں بدل بدل کر صبح کر دیتی تھیں مفروضہ تصور شرافت ان کو کسی مرد سے آنکھیں لڑانے کی اجازت نہیں دیتا تھا ایسی صورت میں وہ مذاقِ ہم جنسی کا شکار نہ ہو جاتیں تو کیا کرتیں [1]

---

[1] ضیا عظیم آبادی — ادب اور جنس — (۱۹۷۹) — ص ۱۰

اس بحث میں الجھے بغیر کہ اس رجحان کے اسباب وعلل کیا ہیں یونگ کا یہ قول بڑی حد تک اس صورتِ حال پر پورا اترتا ہے جسے عصمت چغتائی نے پیش کیا۔ یونگ کہتا ہے "ہر مرد اپنے اندر کچھ نسوانی خصوصیات اور رجحانات رکھتا ہے اور اسی طرح ہر عورت کچھ مردانہ صفات کی حامل ہوتی ہے اگر ایسا نہ ہو تو مرد عورت میں باہم تفہیم کی تمام راہیں مسدود ہو جائیں وقت اور تہذیب نے جب ان پر دو اصناف میں حدِ فاصل قائم کی تو نسائی رجحان نے پشت پناہی کی اور اپنے ہم جنس سے ارتباط قائم کرنے اور لطف اندوز ہونے میں سہولت پہنچائی اسی طرح جب عورتوں سے مرد دور ہو گئے ان کے مردانہ صفات نے تعلقات ہم جنسی استوار کرنے میں ان کو سہارا دیا۔" [1]

عصمت کی نسائی حسیت بے باکانہ انداز میں بورڈنگ کی زندگی کے اس ٹیڑھے پن کو پیش کرتی ہے ایسے کردار جن میں مردانہ اوصاف ہیں ان میں رسول فاطمہ اور سعادت ہیں۔ یہی رجحان ثمن میں بھی ہے لیکن کم۔ رسول فاطمہ ثمن سے مردانہ وار اظہار عشق کرتی ہے۔ ثمن نجمہ سے پیار کرتی ہے اسے نجمہ کی ایک ایک ادا پیاری لگتی ہے۔ نجمہ کے کپڑوں کو چھونے کی خواہش بار بار سر ابھارتی ہے لیکن نجمہ سعادت کی طرف متوجہ ہے۔ ثمن اور سعادت میں غیر محسوس طریقے پر رقابت کا جذبہ پلنے لگتا ہے۔ نجمہ اور سعادت میں ان بن ہو جاتی ہے تو سعادت کو جلانے کے لئے نجمہ ثمن کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ بورڈنگ کی زندگی کے اس پہلو پر عصمت نے جرات مندانہ انداز میں قلم اٹھایا ہے جس سے اردو ادب خالی تھا۔ نسائی حسیت کے بغیر ان نفسیاتی الجھنوں کو ان ہلکی ہلکی لرزشوں کو خوابیدہ جذبات کے ارتعاش کو، چاہے اور چاہے جانے والے جذبات کو اتنی خوبصورتی سے پیش کرنا ممکن ہی نہیں۔ عصمت نے سماج کے اس رخ کو ایک عورت کی نظر سے دیکھا اور پیش کیا۔ آپ اس سے نفرت کریں یا ہمدردی۔ ان مسائل پر لکھنا ضروری سمجھیں یا غیر ضروری۔ عصمت کی پیش کردہ مسلمہ حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا عورت کی نفسیاتی الجھنوں اس کی اندرونی

---

[1] ضیا عظیم آبادی — ادب اور جنس — ۱۹۷۹ء — ص ۲۱۴

دنیا کو جس انداز سے عصمت نے پیش کیا ان سے قبل کسی نے پیش کیا اور نہ مستقبل میں اتنی تیز نسائی حسیت رکھنے والی کسی مصنفہ سے یہ توقع کی جاسکتی ہے۔

دوسری منزل میں عصمت نے ایک اور نسائی مسئلے کو پیش کیا ہے۔ یہ مسئلہ ہے اس نئے طبقے کا جو تعلیم یافتہ اور روشن خیال کہلاتا ہے اس طبقے کی لڑکیاں لڑکوں سے فلرٹ کرتی ہیں اور اپنی ضروریات پوری کرتی ہیں۔ اس طبقے کی نمائندگی بلقیس کرتی ہے۔ بلقیس کی بہن پرنسپل ہے جو گیارہ آدمیوں سے بیک وقت عشق فرمارہی ہیں۔ جن میں دو پروفیسر اور باقی طالب علم تھے۔ بلقیس اور جلیس ان کی دو چھوٹی بہنیں ہیں ان کے عاشقوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔ یہ بہنیں روشن خیال کہلاتی ہیں۔ عموماً شب خوابی کے لباس میں انقلابی نوجوانوں سے ملنے آجاتیں۔ تاش اور کیرم کھیلا جاتا —— بحثیں ہوتیں۔ ان کھیلوں اور بحثوں کی آڑ میں چھوٹی موٹی دست درازیاں ہوتیں کوئی پروہ نہیں کرتا۔ یہ تھوڑی سی آزادی گھر میں خوشحالی لاتی تھی۔ کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس پورے طبقے میں عشق اور نمائشی زندگی کا اظہار ہے۔ بہن اور بھائی کھلے عام عشق کرتے ہیں اور اس معاملے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ لڑکیاں اور لڑکے اکٹھے پکنک پر جاتے ہیں۔ آنکھوں پر پٹی باندھ کر کھیل ہوتا ہے۔ ٹٹول ٹٹول کر چہرے کے نقوش محسوس کئے جاتے ہیں۔ دعوتیں ہوتی ہیں۔ کمزور لڑکیوں کے لئے لڑکوں سے ٹیوشن پڑھوایا جاتا ہے۔ ایسے چھوٹے موٹے واقعات ان کے مضمرات، لڑکے اور لڑکیوں کے فطری انداز میں ایک دوسرے کی جانب کھنچنے کی کمزوری کا استحصال، امیر لڑکیوں کی خوشامد —— عشق کسی غریب سے اور شادی کسی امیر سے کرنے کے ارادے۔ عصمت کی نسائی حسیت نے ان سب کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ انہوں نے مردوں کی ہی نہیں عورتوں کی کمزوری پر بھی ایک عورت کے انداز میں طنز کیا ہے۔ بورڈنگ کی اندرونی زندگی کا بہترین منظر نامہ عصمت کی تیز نسائی حسیت کا کرشمہ ہے۔

اس ناول میں گھریلو زندگی اور خارجی دنیا کا بیان ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ عصمت نے شمن کے مسلم متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے گھرانے کے ذریعہ سماج کے بعض ایسے

مسائل کو چھیڑا جو آج بھی جوں کے توں موجود ہیں۔ یہ مسئلہ ہے لڑکیوں کی شادی کا۔ شمن کی گھریلو زندگی میں دو مرد آتے ہیں۔ اعجاز اور عباس۔! اعجاز شمن کی خالا کا لڑکا ہے گنوار اور اجڈ ہے۔ غلیظ رہتا ہے۔ چھوٹے بڑے سب اس کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ اس کی حیثیت ملازم کی سی ہے۔ ایک پیسہ، آدھی چوسی ہوئی آم کی گٹھلی جھوٹے دودھ چاول کا لالچ دے کر اعجاز سے کام لیا جاتا ہے۔ اس کی خالہ اس کی شادی شمن سے کرنے کی آرزو مند ہیں۔ اس آرزو سے شمن نفرت کرنے لگتی ہے۔ اسے اعجاز سے شدید گھن آتی ہے لیکن وہی اعجاز اس سے قریب رہنے کی کوشش کرتا ہے رات کے وقت جب سب گہری نیند سو جاتے ہیں تو وہ شمن کی پنڈلی سہلانے لگتا ہے وہ اجو جو دن میں احمق اور ہونق نظر آتا ہے رات میں بھوت کی طرح ڈراونا ہو جاتا ہے۔ شمن شدید نفرت سے اس پر چپل کھینچ مارتی ہے لیکن وہ اجو سے اجو کی اس گھناؤنی حرکت کے بارے میں کسی سے کچھ کہہ نہیں پاتی۔ عصمت نے بہت ہی نازک مسئلہ کو چھیڑا ہے۔ ملازم اور ملازم جیسے لڑکے جو بظاہر بے ضرر معلوم ہوتے ہیں جنھیں کوئی اہمیت نہیں دیتا اندر سے بہت ہی خطرناک ہوتے ہیں۔ وہ اپنی دبی ہوئی خواہشوں کی تکمیل ہلکے سے لمس کے ذریعہ پورا کرنا چاہتے ہیں۔ لڑکیاں خوف کے مارے کچھ کہہ نہیں پاتیں اور ایسے لڑکے بھوت بن جاتے ہیں۔ لڑکیاں کس کشمکش، خوف اور ذہنی اذیت سے گذرتی ہیں اس کا علم گھر کے بڑوں کو نہیں ہوتا۔ گھر میں شاگرد پیشہ افراد کی آزادانہ آمد و رفت جوان لڑکیوں کے لئے کتنی خطرناک ہوتی ہے اسے عصمت کی باریک بین نسائی حسیت نے بڑی خوبی سے اجاگر کیا۔

عباس شمن کا چچا زاد بھائی ہے۔ چچا غریب تھے تو سارا خاندان بے اعتنائی برتا کرتا تھا لیکن عباس کے انجینئرنگ پاس کرتے ہی بد قماش چچا، پھوہڑ چچی اور چچیری بہن کی آؤ بھگت شروع ہو جاتی ہے اور ساری جوان لڑکیوں کی مائیں کسی نہ کسی طرح عباس کو پھانسنے کے لئے اپنی لڑکیوں کو چارے کی طرح پیش کرتی ہیں۔ شادی کا مسئلہ کتنا سنگینی اختیار کر گیا ہے۔ متوسط طبقے اپنی ساری شرافت کے اشتہار جس اخلاقی گراوٹ کا شکار

ہے اسے عصمت نے فن کارانہ انداز میں اجاگر کیا۔ خاندان میں ضرورت سے زیادہ لڑکیاں ہوں اور لڑکے نکھٹو تو پھر ذرا بھی درست قسم کے لڑکے کو راغب کرنے کے لئے جو حربے استعمال کئے جاتے ہیں اسے عصمت نے خوبصورتی سے پیش کیا۔ کبھی کبھی یہ سارے حربے خلاف پڑ جاتے ہیں اور لڑکا عیش کر کے چپ چاپ لوٹ جاتا ہے۔ متوسط طبقے کا دوغلا پن، خود غرضی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے کمینگیاں — عصمت نے سب کچھ عیاں کیا ہے عباس بھی خوب عیش کرتا ہے کسی لڑکی کے گال میں چٹکی بھر لی، سر درد کا بہانہ کر کے گھٹنے پر لیٹ جانا — پان بجائے ہاتھ کے منہ میں لینا۔ انگلی کاٹ لینا۔ بھولے سے گھٹنا مسل دینا۔ اور بزرگ ان حرکتوں کو ہنسی مذاق کا نام دے کر نظر انداز کر دیا کرتے ہیں۔ متوسط طبقے کا یہ ڈھونگ، دست درازیوں کے مواقع اور اجازت دینا۔ پھر پردہ پوشی۔ ایک ہی مقصد کہ لڑکا لڑکی کی جانب راغب ہو جائے اور جھٹ سے شادی طے کر دی جائے۔ یہ سب کچھ اس دور کی اقتصادی پریشانیوں کا اظہار بھی ہے۔ اس معاشرے کا بیان ہے جہاں لڑکیاں سینے پر سل ہو جاتی ہیں۔ وہ گھٹن جو دیمک کی طرح متوسط طبقے کو چاٹ رہی ہے جھوٹی آن بان، مصنوعی شان وشوکت کا اظہار انسانی اصولوں اور عظمت کو کھائے جا رہی ہے عصمت کا مشاہدہ، نظر کی گہرائی ان مسائل پر سنجیدگی سے غور وفکر کی دعوت دیتی ہے نتائج سے آگاہ کرتی ہے۔ انہوں نے سماج بالکل اپنے انداز سے دیکھا۔ ان کی نسائی حسیت مسئلے کے پورے منظر کو۔ جزوئیات کے سامنے رکھ دیتی ہے۔ وہ مسئلے کی تہہ تک پہنچ جاتی ہیں۔ وہ پروپگینڈا نہیں کرتیں، تقریریں نہیں کرتیں، اصلاح کا بیڑہ نہیں اٹھاتیں فیصلہ پڑھنے والوں پر چھوڑ دیتی ہیں وہ ایسے موڑ پر چھوڑتی ہیں کہ آدمی اپنے گریبان میں منہ ڈالنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کالج کی زندگی میں وہ پریما سے ٹکراتی ہے۔ پریما ایک آزاد خیال لڑکی ہے کوئی لڑکا اس کے شانے پر سر رکھے اونگھتا ہے گاڑی کے جھولے سے کسی لڑکے کا سر اس کے سینے پر آ گرتا ہے۔ یا کوئی اس کے برہنہ بازو پر اپنی مونچھیں چھونے لگتا ہے۔ لیکن وہ پرواہ نہیں

کرتی۔ شمن پریما کے بھائی نریندر سے ملتی ہے۔ اس کے والد رائے صاحب سے بڑے ڈرامائی انداز میں ملتی ہے۔ اور انہیں پیار کرنے لگتی ہے۔ رائے صاحب کی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ بہت ہی زندہ دل اور فن کار آدمی ہیں۔ اپنے بچوں نریندر اور پریما کے ساتھ وہ بے تکلف دستوں کی طرح رہتے ہیں۔ رائے صاحب فلپ نامی عورت سے عشق کرتے ہیں۔ نریندر شمن میں دلچسپی لیتا ہے لیکن شمن کو نریندر سے کوئی لگاؤ نہیں۔ پریما کے گھر کا کھلنڈرا ماحول ہے۔ ایک دوسرے کا مذاق اڑایا جاتا ہے نوچا کھسوٹا جاتا ہے لیکن اس میں جنسی غلاظت نہیں ہوتی۔ شمن کی حرکتوں میں بے ساختگی نہیں ہے۔ رائے صاحب اس کے ساتھ ویسے پیش آتے ہیں جیسے پریما کے ساتھ — شمن کو زندگی میں پہلی بار محبت ملتی ہے اور وہ اس محبت کا مفہوم نہیں سمجھ پاتی۔ رائے صاحب اسے خوابوں کے مرد نظر آتے ہیں وہ ان سے محبت کرنے لگتی ہے اور ایک دن عجیب حالات میں وہ عمر کی ساری حدیں پھلانگ کر رائے صاحب سے اظہار عشق کر بیٹھتی ہے۔ پریما اور نریندر حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ شمن کا رائے صاحب سے اظہار عشق کرنا دراصل اس پدرانہ شفقت کی کمی اور محرومی کا ردّ عمل ہے۔ شمن اس محبت کو کوئی نام نہیں دے پاتی وہ اسے عشق سمجھتی ہے۔ اس سے قبل کہ وہ اپنے ندامت اس جذبے پر نظر ثانی کرے رائے صاحب کا انتقال ہو جاتا ہے۔ شمن اس صدمے سے بیمار پڑ جاتی ہے۔ پھر گھر میں تنہائی کے احساس سے گھبرا کے وہ یونیورسٹی میں داخلہ لیتی ہے۔ جہاں اس کی ملاقات ترقی پسند گروپ سے ہوتی ہے۔ اس گروپ میں افتخار ہے، سینتل، مس یوگا اور ایلما نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ خارجی دنیا میں ٹکرانے والے کرداروں میں ایلما سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ عصمت نے اس کردار کے ذریعہ کنواری ماں اور ناجائز بچے کے تصور کو پیش کیا اور نسائی نقطہ نظر واضح کیا۔ ایلما کے خیالات مردوں کے بارے میں عجیب و غریب ہیں وہ بڑی بے باکی سے اظہار خیال کرتی ہے وہ کہتی ہے کچھ مردوں کو دیکھ کر سوئی ہوئی مامتا جاگتی ہے — کچھ مردوں کے ساتھ لمبا چوڑا سفر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کچھ مردوں کے ساتھ ایک بار تجربہ کے طور پر تعلق قائم کر کے انہیں بھول جانے کو

جی چاہتا ہے ان کی صورت سے گھن آتی ہے تصور سے جی متلاتا ہے۔ کچھ مردوں سے محبت نہیں ہوتی مگر جی چاہتا ہے کہ پہلا بچہ اس مرد سے ہو۔ ایلما جنس کے بارے میں کھلی گفتگو کرتی ہے اور خود کو باشعور اور باغی لڑکی سمجھتی ہے۔ لیکن یہی ایلما ستیل سے نفرت کرنے کے باوجود اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوتی ہے۔ ثمن سوچتی ہے نہ جانے کیوں سماجی اصولوں کے آگے قدرت کے بنائے ہوئے اصول کمزور اور ناقص ہو جاتے ہیں عورت کو قدرت کی طرف سے ماں بننے کی مکمل آزادی ہے مگر سماج اس سے پروانۂ راہداری مانگتا ہے۔ ثمن ترقی پسند ہونے کے باوجود یہ سمجھتی ہے کہ ایلما نے پاپ کیا ہے۔ جبکہ ایلما اسے پاپ نہیں سمجھتی۔ اسے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ اس نے اپنی روح کو دھوکہ دے کر جسم کا پیٹ بھر دیا۔ اسے سیتل سے شدید نفرت ہے اس لئے وہ ابارشن کروانا چاہتی ہے وہ سیتل کا تحفہ ٹھکرا کر اسے شرمندہ کرنا چاہتی ہے۔ سیتل اس سے شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ انکار کر دیتی ہے اس کا نقطہ نظر یہ ہے کہ کوئی چیز زمین پر گر کر مٹی میں لتھڑ جائے تو اسے پونچھ کر کھانے کی ضرورت نہیں بلکہ اپنے نقصان پر صبر کر کے اسے پھینک دینے میں ہی مصلحت ہے۔ لیکن عصمت ہندوستانی مروجہ سماج کے تناظر میں اس کنواری ماں کے بارے میں سوچتی اور نسائی حقیقت نگاری سے کام لیتی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں "نہ جانے کیوں اس کا گلا بھر آیا اگر ایک درخت قدرت سے جنگ شروع کر دے تو کتنے دن زندہ رہ سکتا ہے۔ آم بور لگتے ہی مچل جائے اور پھل پیدا کرنے سے انکار کر دے تو؟ مگر ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس بغاوت کا حق تو اشرف المخلوقات کو حاصل ہے۔ مگر یہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ بغاوت اس نے سیکھی کہاں سے ہے؟[1]

مگر اشرف المخلوقات بھی قدرت کے آگے ہار جاتا ہے۔ ایلما ماں بن جاتی ہے۔

اس کا بچہ سیتل سے مشابہہ ہے ایلما محسوس کرتی ہے جیسے قدرت اسے چڑا رہی ہے۔ وہ اپنے بیٹے سے شدید نفرت کا اظہار کرتی ہے۔ عصمت ناجائز بچوں کی پیدائش کو

1۔ ٹیڑھی لکیر ص۔ ۳۱۷

اقتصادی مسئلہ سمجھتی ہیں۔ مردانہ سماج میں مرد کو فوقیت حاصل ہے اس لئے عصمت شادی کی اہمیت کو تسلیم کرتی ہیں اقتصادیات کی باگ ڈور بھی مرد کے ہاتھوں میں ہے۔ اس لئے عصمت اپنے نقطہ نظر کا اظہار اس طرح کرتی ہیں۔

''سماج ایسے بچے کو صرف اس لئے برا سمجھتا ہے کہ وہ بیاہ کے منتروں کے چھینٹوں میں نہائے بغیر دنیا میں آجاتا ہے اور میں۔۔۔۔

''نہیں۔۔۔ سوسائٹی کی اجازت کے بغیر دنیا میں آجاتا ہے۔۔۔۔ تمہیں رول سے اس لئے نفرت ہے کہ وہ تمہارے حکم کے بغیر دنیا میں آیا۔ اسی طرح سوسائٹی کو بھی۔۔۔۔''

مگر کیوں؟— سوسائٹی کو کیا مطلب؟

''اس لئے کہ ایسے انسانوں کی تعداد دنیا میں نہ بڑھے جو بن وارث کے ہوں۔ تم جانتی ہو عورت ہی تنہا ذمہ دار رہ جاتی ہے۔ باپ کے منہ پر کوئی مہر نہیں پڑتی۔۔۔۔ اب ذرا سوچو اگر شادی کا اسٹامپ نہ لکھایا جائے تو عورت جس کی اقتصادی حیثیت صفر کے برابر ہے کیا کرے۔۔۔؟''

''ہوں تمہاری رائے میں ناجائز بچے صرف مالی مشکلات کی وجہ سے دوبھر معلوم ہوتے ہیں۔؟

''اور کیا خود سوچو ایک ماں قدرت کے بنائے ہوئے اصول کے مطابق آنے والے بچے سے کیوں نہ محبت کرے؟ کیا وہ اس کے جسم کا ایک ٹکڑا نہیں۔ دینے والے نے نعمت دی اور لینے والے نے پائی۔ پھر باپ کیوں ڈرے ماں کیوں تھرائے؟ صرف اس لئے کہ اس کا پالنا پوسنا دوبھر ہے۔''[1]

عصمت چغتائی نے اس نقطہ نظر میں پوری نسائی حسیت دکھائی ہے دراصل قدرت نے عورت کو اس طرح بنایا ہے کہ اس کے ماں بننے کے پورے جسمانی ثبوت

---

[1] ٹیڑھی لکیر ص۔۳۸۱

موجود ہوتے ہیں جب کہ مرد کسی بچے کو شناخت کا وسیلہ نہیں بنا سکتا۔ اس کے پاس ایسا کوئی جسمانی اور ظاہری ثبوت نہیں ہوتا جس کی بناء پر وہ بچے کا باپ کہلائے۔ اس لئے مرد کی شناخت کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ شادی کرے اور عورت پر اس طرح نگرانی رکھے کہ وہ کسی اور مرد سے تعلق قائم نہ کر سکے۔ عورت کی گواہی کے علاوہ کوئی اور ثبوت مرد کے پاس نہیں۔ دوسری طرف یہ جسمانی ثبوت عورت کے لئے سوہانِ روح بن جاتا ہے اور مرد کسی بھی ذمہ داری سے بری ہو سکتا ہے عصمت نے اپنی نسائی حسیت سے کام لے کر اس پورے مسئلہ کو صحیح ڈھنگ سے پیش کیا۔ وہ لکھتی ہیں۔

"اور شادی کے بعد؟"

"تب مرد اسے اپنا فرض سمجھ کر برداشت کر لیتا ہے۔"

"سوسائٹی کا باندھا ہوا فرض؟"

"ہاں۔۔۔ مگر اس کا اب وہ اس درجہ تک عادی ہو چکا ہے۔ کہ اس بار کو اپنا سمجھتا ہے لفظ "اپنا" اس کی خود پرستی کے جذبے کو تسکین دینے کے لئے کافی ہے۔"

"اور ناجائز کو اپنا نہیں سمجھتا؟"

"مجبور نہیں۔۔۔ قانوناً بھی تو وہ اس کا نہیں۔۔۔ قانون کے بغیر اس کی ماں بھی غیر ہوئی۔۔۔"

"لیکن ماں۔ ماں کیوں نفرت کرے"

کیوں کہ وہ کوئی کمانے والا ساتھ نہیں لاتا اس کی پرورش کا بار اس کی زندگی کے پیروں میں بیڑی بن کر الجھ جاتا ہے [1]

عصمت نے پورے مسئلہ کو مروجہ سماج کے آئینے میں دیکھا ہے اور وہ اقتصادی اہمیت کو سمجھتی ہیں۔ ایلما نے جو جسم اور روح کا فلسفہ پیش کیا عصمت اس کو بھی نہیں مانتیں وہ لکھتی ہیں۔

---

[1] ٹیڑھی لکیر ص۔ ۳۸۶

''تمہارا فلسفہ بالکل بے بنیاد ہے اور پوچ ہے کہ جسم اور روح جدا جدا ہیں۔۔۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ستیل کو تمہارے جسم نے چاہا اور روح نے نفرت کی۔ پگلی دل و دماغ دھوکہ کھا سکتے ہیں مگر جسم دھوکے میں نہیں رہتا۔ وہ وقت آنے پر سچ بول دیتا ہے۔ مگر تم نہیں مانتیں کہ تم ستیل سے محبت کرتی تھیں اب تمہاری آتما اس کی خواہش میں تمہیں سزا دے رہی ہے کیوں کہ وہ تمہیں نہیں ملتا اس لئے اس فراق کی جلن تم اس کے بچے سے انتقام لے کر بجھانا چاہتی ہو اور یہ بھولنا چاہتی ہو کہ یہ تمہارا بھی ہے۔ [1]

عصمت ترقی پسندی کے نام پر کھوکھلے خیالات کے اظہار پر برہم ہوتی ہیں اور پول کھولتی ہیں وہ عورت کو اس کی صحیح پوزیشن پر دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ عورت اس سماج میں پورے وقار کے ساتھ زندہ رہے۔

خارجی دنیا کے مسائل میں عصمت نے تعلیم نسواں کے کھوکھلے پن کو بھی اجاگر کیا اور اس مسئلہ کو دردمندانہ انداز میں سوچا۔ انہوں نے اسکولوں کا کھوکھلا ماحول، سرسری معائنے، سرسری رپورٹ، بدانتظامی، دھوکہ، جعلسازی کو بے نقاب کیا جسے لوگ اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ وہ ان ٹیچروں کی سچی تصویر دکھاتی ہیں جن کے شانوں پر ایک نسل کو سنوارنے کی ذمہ داری ہے انہیں محکمہ تعلیم اسپتال جیسا لگتا ہے ایسی عورتیں ٹیچر بنے آئی ہیں جو لاغر بیمار اور دکھی ہیں جو دنیا کے ہر شعبے میں ناکام ہونے کے بعد پیٹ پالنے کا آخری سہارا محکمہ تعلیم کو سمجھتی ہیں۔ عصمت لکھتی ہیں۔

''یا تو بدصورتی یا غربت کی وجہ سے میاں نہ ملا ہو یا بیوہ ہوگئیں اور جن پر جا کے پڑیں انہوں نے نکال دیا۔ بال بچوں کی خاطر یہ پیشہ کررہی ہیں چاہے تعلیم کارتی برابر شوق نہیں ہے دماغ میں گوور ہے۔ یہ بڑھانا تو درکنار پڑھنے ہی کی طاقت نہیں مگر چلی آرہی ہیں ادھر محکمہ تعلیم بھی کسی نہ کسی طرح تعلیم نسواں کو ترقی دیتا ہے۔ یہ گمان میں کہ یہ

---

[1] ٹیڑھی لکیر ص۔۳۶۱

انسانی میل کچیل اور کوڑا ہی سہی اچھا مال بھی آنے لگے گا۔" [1]

ان استانیوں کے بارے میں عصمت لکھتی ہیں "کیا حاصل اس مغز پاشی سے جب بیج ہی گھنا ہوا ہے تو پودے کے اگنے اور پھل دینے کی آس لگانا فضول ہے۔ [2]

عصمت صرف مرد ہی کے نہیں عورت کے عیبوں کو بھی دکھاتی ہیں۔ اسکولوں کی زندگی کی عصمت نے سچی عکاسی کی ہے۔

مسلم متوسط طبقے کی گھریلو زندگی کی عکاسی بڑی عمدگی کے ساتھ کرتی ہیں نوری اس سماج کی ایک "اچھی" لڑکی ہے۔ وہ اپنے خیالوں میں ایک رومانی شہزادے کو بسائے ہوئے ہے۔ ماں اسے عباس کی طرف توجہ دینے کو کہتی ہے تو وہ چپ چاپ اس کا حکم مان لیتی ہے۔ وہ ایک عام متوسط طبقے کی لڑکی ہے۔ اپنے شوہر کے متعلق سنے سنائے افسانے ساس نند کے دکھڑے، ٹیکہ جھومر پازیب کا ذکر، روحانی کورٹ شپ کرتی ہے تخیل کی مدد سے وہ خیالات کے ہنڈولوں میں جھولتی جاتی ہے نوری ایک ایسی لڑکی ہے۔

جس نے مروجہ مردانہ سماج سے سمجھوتا کرلیا ہے۔ یہ سدھائی ہوئی لڑکی ہے جسے اس بات کی تربیت دی جاتی ہے کہ وہ مرد کو مجازی خدا سمجھے اور ایک سدھائے ہوئے جانور کی طرح زندگی گذارے، جس سے بیاہ کیا جائے اسے چپ چاپ قبول کرلے اور جب تک طاقت رہے بچے پیدا کئے جائے اور پھر کسی دائمی مرض میں مبتلا ہو کر دکھ سہتی ہوئی ایک دن اللہ کو پیاری ہو جائے۔ اور جنتی بیوی کہلائے۔ ہندوستانی سماج میں لڑکی کی جو حیثیت ہے اس کے بارے میں عصمت لکھتی ہیں "عورت! کیا یہی تھی عورت جو حلوے کی مرغن قاب کی طرح سجا بنا کر کل ایک نئے مہمان کے سپرد کردی جائے۔ اسے نہلا دھلا کر عطر میں بسایا جائے گا اگر تھوڑی بہت بساند ہو بھی تو معلوم نہ پڑے ایسے ہی جیسے سڑے گلے آلو کی چاٹ بنانے والا تلخی چھپانے کے لئے ڈھیر سارا مسالہ چھڑک دیتا ہے بالکل اسی طرح دلہن کو شیرے میں لتھڑ کر دولہا کے حلق میں اتار دیا جائے گا اور جب ایک بار نگل گیا۔ مہا شیر اپنا

---

[1] ٹیڑھی لکیر ص۔ ۲۹۵

ہے یہ وقتی وارنش دو چار گھسّوں میں اُتر جائے گی اور دلہن صرف بیوی رہ جائے گی لفظ بیوی کے خیال ہی سے شمن کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ نوری کے نوجوان جسم سے لپٹے ہوئے درجنوں بچے اور ہزاروں فکریں جونکوں کی طرح چپکی خون چوستی نظر آنے لگیں۔ [1]

اس لفظ بیوی کے پیچھے عورت پر مظالم کی کتنی لمبی داستاں ہے اسے سوچ کر عصمت کانپ جاتی ہیں۔ بیوی جس کا مصرف بچے پیدا کرنا، ان کے نام رکھنا، گوشت ترکاری کا حساب کتاب کرنا ہے۔ عورت کو ذاتی ملکیت سمجھنے کے تصرف کے خلاف بھی عصمت احتجاج کرتی ہیں۔

''اسے نوری بالکل گائے بیل کی طرح لگ رہی تھی اکیاون ہزار میں وہ اپنی جوانی کا سودا کر کے ایک مرد کے ساتھ جا رہی تھی بیوقوفوں کی طرح نہیں پکّا کاغذ لکھا کر اگر وہ بعد میں تڑپے تو، اور پھندا اس کے گلے میں تنگ ہوتا جا رہا ہے اور وہ چغد بھی ڈھول تاشے سے اسے خرید کر لے جا رہا ہے۔ آخر فرق ہی کیا ہے اس سودے میں اور آئے دن جو چاوڑوں میں خرید و فروخت ہوتی رہتی ہے وہ چھوٹا موٹا بیوپار ہے جیسے کچالو، پکوڑیوں کی چاٹ اور یہ لمبا ٹھیکہ ہے جب تک ایک فریق خیانت نہ کرے بیوپار چلتا رہتا ہے ورنہ سودا پھٹ!'' [1]

عصمت شادی کو ایک سودا سمجھتی ہیں جس میں عورت کی مرضی نہیں پوچھی جاتی بلکہ اس کا سودا گائے بیل کی طرح کر دیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی وہ دوسرا رخ بھی دکھاتی ہیں جب عورت مرد کے پیر کی زنجیر بن جاتی ہے اور مرد کی حیثیت غلام جیسی ہو جاتی ہے بیویاں شوہروں کی کمائی پر اس طرح قابض ہو جاتی ہیں جیسے خون چوسنے والے سرمایہ دار غریبوں کی مشقت پر۔ عصمت نے گھر بیٹھ کر مرد کی کمائی پر راج کرنے والی عورت اور ہاتھ پیر ہلائے بغیر مرد کو غلام بنائے رکھنے والی عورت کی بھی تصویر کھینچی اور اس خیال کو غلط ثابت کیا کہ ہندوستانی سماج میں عورت صرف مظلوم ہوتی ہے مردانہ سماج میں عورت کو گھر کی چار دیواری میں بند کر دیا گیا ہے لیکن اس چار دیواری میں وہ حاکم کی حیثیت رکھتی ہے۔ عصمت

---

[1] ٹیڑھی لکیر ص۔ ۲۹۵

اپنی نسائی حسیت اور تیز مشاہدے کے ذریعہ مسائل کا غیر جانبدار جائزہ لیتی ہیں۔ وہ عورت کو ایسا حاکم سمجھتی ہیں جو پرجا کا چاکر بن کر انہیں اُلّو بناتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں ''عورت اگر گائے ہے تو گائے سینگ بھی مارتی ہے۔۔۔ گائے سوائے گھانس کھانے اور دودھ دینے کے اور کیا کام کرتی ہے دودھ بچھڑے نے پیا آدمی نے کھیر بنا کر کھالیا اس کی بلا سے نہ ہاتھ ہلانے کی ضرورت نہ پیر پھر بھی انسان گائے کی پوجا کرتا ہے کوئی بیل کو پوچھتا بھی نہیں۔'' [1]

پردے کے حامی مردوں پر طنز کرتی ہیں کہ کس طرح وہ اب تک خیالی دنیا میں کھوئے رہے۔ عورت کے پردے میں رہنے سے مرد کا نقصان تھا وہ ہر عورت کو حور پری سمجھا کرتے تھے پردہ ختم ہونے کے بعد عورت صرف عورت ہو کر رہ گئی۔ اور زندگی کی حقیقتوں سے نظر ملانے کا مرد میں حوصلہ پیدا ہوا۔ وہ لکھتی ہیں۔

''ٹھیک کہتے ہیں یہ بوسیدہ لوگ کہ عورت کو پردہ میں رہنا چاہیے۔ سچ تو ہے کتنے مزے سے پردے میں آنکھ مچولی کھیلی جا سکتی ہے جی چاہا جس سے چھپ گئے اور جی چاہا جسے دکھا دیا بدصورت تو خاص فائدہ میں رہتی ہوں گی جسے ہلکی سی جھلک دکھائی دی وہی حسین سمجھ بیٹھا یہ تھوڑی کہ مقابل بیٹھے ہیں اور ہر عیب سامنے رکھا دل دکھا رہا ہے............ یہ پردے سے نکل کر حسینہ سے صرف عورت کیوں رہ گئی ہے؟ وہ اس کے سارے قتل و غارت کے حربے کیا ہوئے؟ تیر نظر کند اور ابروؤں کی دھار کھٹل! بات یہ ہے کہ پردہ سے نکل آنے پر غازہ، سرمہ، مسّی کا راز کھل گیا۔ سب کو معلوم ہو گیا کہ آبرو نوچ کر کمانیں بنائی گئی ہیں اور آنکھوں سے بجلیاں مسکارہ کی مدد سے گرائی جا رہی ہیں ہونٹ ''تنجی'' کے صدقے برگِ گل بنے ہوئے ہیں اور گالوں پہ روژ کی شفق کھیل رہی ہے۔ گو ویسے ہندوستان میں جتنی حسن کی قلت پہلے تھی اب بھی ہے مگر یہ پردہ ہٹ جانے سے نظر کا پردہ ہی اٹھ گیا، عورت بڑے نقصان میں رہی'' [2]

---

[1] ٹیڑھی لکیر ص۔ ۲۹۸

[2] ٹیڑھی لکیر ص۔ ۲۹۶

وہ سماج اور مرد کی حیثیت، عورت کا ماں بننا، ایسے مسائل کو اشترا کی انداز میں سوچتی ہیں جہاں طبقاتی فرق اور اقتصادیات کو سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ اشترا کی نظریہ جنسی تفریق کے مقابلے میں طبقاتی فرق کو اہم مانتا ہے۔ عصمت ثمن اور اقبال کی گفتگو کے ذریعہ اس نظریہ کو پیش کرتی ہیں لیکن کوئی واضح حل ان کے پاس نہیں اور وہ اس کا اعتراف بھی کرتی ہیں۔ جب ثمن اقبال سے کہتی ہے کہ ہر معاملے میں سماج عورت کا جینا دوبھر کر دیتا ہے اور مرد بڑی لاپرواہی سے زندگی گذارتے ہیں تب اقبال کہتا ہے۔

''جب ہم نے ہی سماج بنایا ہے تو ہم ہی توڑ سکتے ہیں۔''

مگر اور بھی مصیبتیں ہیں جو صرف عورتوں کو بھگتنا پڑتی ہیں، ثمن نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''یعنی بچہ وغیرہ؟''

''جی ہاں''

''بھئی واہ کیا عورت ہیں آپ بھی کہ اپنے عظیم ترین فرض کو مصیبت سمجھتی ہیں جبھی تو لوگ کہتے ہیں عورتوں کو زیادہ نہیں پڑھانا چاہیے''

''ارے!'' اس کی سمجھ نہ آیا کہ کیا جواب دے وہ اس کی بدحواسی پر زور زور سے ہنسا

'مگر جو بچے ہوں گے وہ۔۔۔''

''حرامی ہوں گے؟''

''ہاں''

''حد ہے بھئی ہمارے اور آپ کے نظریے بہت مختلف ہیں میں حرام حلال اور جھٹکا سب کو ایک ہی چیز سمجھتا ہوں قدرت کے اصول کی پیروی کر کے پیدا ہونے والا جاندار انسان بننے کا حقدار ہے۔''

''مگر میرا مطلب ــــ اقتصادی مشکلات''

''تو یوں کہیے میاں نہیں بینک کی کتاب چاہیے''

''یونہی سمجھ لیجئے—''

ثمن کو لا جواب سا دیکھ کر افتخار کو دکھ سا ہوا وہ بولا۔

''ٹھیک کہتی ہیں۔ یہی تو وہ سوال ہے جس کا جواب میں برسوں سے تلاش کر رہا ہوں''۔ ؎۱

اس طرح عورت کی حیثیت ناجائز بچوں کے مقام کا سلسلہ اقتصادیات سے جا ملتا ہے اور اس کا کوئی جواب ہندوستان کے پس منظر میں اشتراکی نظریے والوں کے پاس کوئی نہیں۔

عصمت نے مردانہ سماج کی نمائندگی کرنے والے مردوں کو بھی خالص نسائی نظر سے دیکھا ہے۔ گھریلو دنیا میں اعجاز اور عباس ہی نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ متوسط گھرانے کے لڑکے جن میں ان کی غربت کی وجہ سے ٹھکرا دیا جاتا ہے لوگ انہیں حقارت سے ٹھوکر مارتے ہیں لیکن جب ان کے پاس دولت آجاتی ہے تو ان کی آؤ بھگت کی جاتی ہے اور یہ لوگ ہر دو صورتوں میں زندگی کو جھیلتے ہیں جن لوگوں نے ان کے ساتھ حقیر برتاؤ کیا ان کا استحصال بھی کرتے ہیں۔

خارجی دنیا میں افتخار سیتل، پروفیسر اور ٹیلر ہیں ہیں ان میں سب کے سب ترقی پسند ہیں سوائے ٹیلر کے جو امریکی فوجی ہے۔ ان مردوں نے ترقی پسندی کو بطور فیشن اپنایا ہے۔ عصمت انہیں طنز کا نشانہ بناتی ہیں۔ ان ترقی پسندوں نے یہ انداز اپنایا ہے کہ جو کچھ تمہارا ہے وہ میرا اور جو کچھ میرا وہ تمہارا نہیں۔ جن ترقی پسندوں نے عجیب وضع قطع بنا رکھی تھی۔ شراب میں دھت رہنے کو ترجیح دیتے تھے ان پر بھی عصمت طنز کے وار کرتی ہیں۔ ترقی پسند تحریک میں عورت کو جس طرح شامل کیا گیا اس کے بارے میں وہ لکھتی ہیں۔

''زندگی کی دوسری گاڑیوں کی طرح یہ انقلاب کا چھکڑا ابھی اکیلے بیل سے نہیں گھسیٹتا صنفِ نازک کا وجود لازمی ہے کوئی آزاد خود مختار خاتون جو دنیا کی بکواس کا خیال نہ کرے'' ؎۲

؎۱ ٹیڑھی لکیر ص۔۲۸۶۔۲۸۷

؎۲ ٹیڑھی لکیر ص۔۲۷۲

سارے ترقی پسند مرد کردار عورت کو گلیمر کی چیز سمجھتے ہیں۔ افتخار سب سے نمایاں کردار ہے جو ترقی پسند ہے۔ یونیورسٹی میں اس کی بہت اہمیت ہے چند لمحوں میں وہ یونیورسٹی کو بہکا سکتا ہے ذرا سی دیر میں فساد ختم کر سکتا ہے۔ وہ نکاح اور شادی کا قائل نہیں ہے اس نے کتنی بار محبت کی خود اسے یاد نہیں وہ معشوقائیں بنا بنا کر تھک چکا ہے۔ وہ لڑکیوں سے ہمدردی حاصل کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ وہ دق کا مریض ہے۔ ثمن اس سے پیار کرنے لگتی ہے۔ اس کی مالی امداد کرتی ہے تحائف دیتی ہے لیکن آخر میں پتہ چلتا ہے کہ وہ شادی شدہ ہے اس کی ایک بیوی اور کئی بچے ہیں ثمن کی مالی امداد وہ اپنے بیوی بچوں تک پہنچاتا رہا۔ اس کی بیوی اس کے سارے معاشقوں سے واقف ہے۔ یہی اس کی گذر بسر کا ذریعہ ہے۔ اس کی بیوی اس کی محبوباؤں سے پیسہ وصول کرتی ہے۔ سیتل بھی ترقی پسند ہے لیکن اس کے انداز کے بارے میں عصمت نے جو کچھ لکھا وہ صرف ایک عورت ہی محسوس کر سکتی ہے۔ کسی مرد کے بارے میں اس طرح سوچنا نسائی حسیت کا ہی کرشمہ ہے عصمت لکھتی ہے۔

''جیسے فاحشہ عورتیں سینہ تانے کمر لچکاتی ناز و عشو کی بجلیاں گراتی لوگوں کے دل مسلتی چلتی ہے اسی طرح بعض مرد بھی اپنے جسم کی سستی اور چھچھوری نمائش کیا کرتے ہیں! سیتل کی ہر جنبش سے معلوم ہوتا وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے ''لو دیکھ لو۔ یہ مضبوط قہقہے۔۔۔۔ یہ چوڑا چکلا سینہ۔ ہے ہمت نظر بھر کے دیکھنے کی؟'' [1]

سیتل عورت کا ایک ہی مصرف سمجھتا ہے۔ وہ ایلما سے ہونے والے بچے کا باپ ہے۔ وہ ایلما کو شادی کا آفر دیتا ہے لیکن ایلما ٹھکرا دیتی ہے۔

پروفیسر ہے جو قوم پرست ہے۔ ترقی پسند کہلاتا ہے لیکن جب اسے بہتر تنخواہ ملتی ہے تو ساری ترقی پسندی بھول جاتی ہے۔ عصمت ایسے سارے نوجوانوں پر طنز کرتی ہیں جو ترقی پسندی کا مطلب نہیں سمجھتے۔ جن کا موضوع صرف 'طوائف' ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔ ''آپ لوگ بڑے زبردست مغالطے میں ہیں سمجھتے ہیں جیسے جنت میں حوریں ملیں گی۔ ویسے ہی اشتراک عورتیں بخشنے لگے گا ہنہ تھوڑی سی تھیوری پڑھ لی اور اشتراکی بن گئے

ایسے اشتراکی ہندوستانی اشتراکی بیشک ہو سکتے ہیں مگر اصل مقصد اشتراک کا کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔"

عصمت ایسے ترقی پسند مردوں کی سخت مخالفت کرتی ہیں جو طوائف کو اپنا موضوع بنا کر خبط اٹھاتے ہیں۔ وہ ایسے مصنفین سے پوچھتی ہیں "مجھے اعتراض کرنے کا حق تو نہیں مگر پوچھتی ہوں ان رنڈیوں کی تو آپ رگ رگ سے واقف ہیں کیا مرد ایسے نہیں ہوتے ذرا نہیں بھی تو ڈھونڈ کر سامنے گھسیٹ لائیے۔ یا بس انہیں ہمیشہ ظالم، بے رحم، دغا باز، حرام کے بچے پیدا کرنے والا ہی دکھاتے ہیں۔ بڑے روشن خیال بنتے ہیں مگر آپ کا بھی یہی خیال ہے کہ عزت اور عصمت صرف عورت ہی کی ہوتی ہے مردان خصوصیات سے پاک ہے۔۔۔"[1]

مندرجہ بالا اقتباس میں عصمت کی نسائی حسیت عروج پر نظر آتی ہے۔ اور مطالبہ کرتی ہیں کہ مردانہ سماج کا یہ ایک طرفہ رویہ ختم ہونا چاہیے اور مرد کو بھی عورت کے برابر گناہ گار سمجھنا چاہیے اور جس سزا کا مستحق عورت کو سمجھا جاتا ہے وہی مرد کو بھی ملے اور سماج ایسی عورت سے ہی نفرت نہ کرے بلکہ مرد کو بھی قابل نفرت سمجھے۔

عصمت نے ہندوستانی سماج میں سانس لیتی ہوئی ایسی عورت کی عمدہ عکاسی کی ہے جو ایک طرف آزاد خیال بننے کی کوشش کرتی ہے خود کو ذہین اور چرب زبان سمجھتی ہے۔ بظاہر بہت بہادر اور مضبوط نظر آتی ہے لیکن عورت ہونے کے خوف سے چھٹکارا نہیں پا سکتی۔ عصمت نسوانیت کو چھوٹی موٹی بنا کر دکھانے کی سخت مخالف ہیں۔ وہ اسے بزدل سمجھتی ہیں۔

ناول کا آخری حصہ کمزور ہے۔ اور پیوند لگتا ہے۔ شمن کی ملاقات آئرش جوان ٹیلر سے ہوتی ہے۔ وہ رنگ وروپ اور نسل کے اعتبار سے مختلف ہے دونوں شادی کر لیتے ہیں لیکن خوش نہیں رہ سکتے دونوں اپنے جائز رشتے کو گناہ کی طرح چھپاتے ہیں کیوں کہ سماج میں ان کی حیثیت عجیب وغریب ہو جاتی ہے۔ البتہ اس حصے میں عصمت نے جنگ کی

---

[1] ٹیڑھی لکیر ص۔ ۴۵۹

ہولنا کیوں کو ایک عورت کی طرح محسوس کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں ''جب کھیل ختم تو پیسہ ہضم ۔۔۔ توپیں پگھلا کر ریل کی پٹریاں بنائی جائیں گی بندوقوں کی فراٹے بھرتی ہوئی موٹریں بنیں گی ۔۔۔ تھوڑی سی دہات ان کے حصے میں تمغوں کی صورت میں آجائے گی جس سے آنے والے بچوں کے جھنجھنے بنائے جائیں گے۔ جب کٹتے مرتے انسان تھک جائیں گے ملاپ ہو جائے گا سپاہی اپنا کٹا ہاتھ یا پیر دے کے گھر جا بیٹھے گا اور جب تک پھر نہ لڑیں وہ کبھی کبھی استعمال ہونے والے ہتھیار کی طرح پڑا زنگ کھایا کرے گا۔ جب لڑائی ختم ہو گی اسکولوں میں چھٹیاں ہوں گی۔ ڈنر پارٹیاں ہوں گی اور سپاہی؟ اس سپاہی کا کیا ہو گا؟ پگھلا کر چورا چکے اور ننگے بھوکے فقیر ڈھالے جائیں گے۔[1]

عصمت کا یہ ناول ان کی نسائی حسیت کے اظہار کی وجہ سے اردو کا ایک عظیم ناول بن گیا ہے۔ اردو ادب میں شاید ہی کوئی اور ناول ہو گا جس میں ایک عورت نے نسائی انداز میں اپنے عصر کے مسائل پر نظر ڈالی ہو اور اپنے ذاتی نقطہ نظر سے ان مسائل پر سوچا ہو۔ نسائی حسیت کے اعتبار سے یہ بہت ہی اہم ناول ہے۔ اس میں ایک عورت گھریلو زندگی کی تصویر کشی بھی کرتی ہے اور خارجی زندگی کی بھی۔ گھریلو زندگی میں بھی اس کی نسائیت جگہ جگہ ٹکراتی ہے اور خارجی زندگی میں بھی اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ''ٹیڑھی لکیر'' اردو ادب کا ایک اہم ناول ہی نہیں بلکہ نسائی حسیت کے اظہار کا بہت ہی اہم ناول ہے۔

معصومہ میں عصمت چغتائی نے مردانہ سماج میں عورت کس طرح جسم فروشی پر مجبور ہے صنعتی شہروں کے سیٹھ کس طرح عورت کو کھلونا سمجھ کر اپنی ہوس مٹاتے ہیں۔ اس ناول کا پس منظر بمبئی کی مشینی زندگی اور فلمی دنیا ہے۔ معصومہ ایک حیدر آبادی جاگیر دار گھرانے سے تعلق رکھتی ہے جس کا باپ رضا کاروں کی فوج کا رکن تھا اور پولیس ایکشن میں حالات بگڑتے دیکھ کر بڑے بیٹوں کے ساتھ روپیہ پیسہ، قیمتی زیور، مکانات کے کاغذات لے کر پاکستان بھاگ جاتا ہے۔ معصومہ کی ماں تین بیٹیوں اور ایک چھوٹے بیٹے

---

[1] ٹیڑھی لکیر ص۔۴۷۲

کے ساتھ اکیلی رہ جاتی ہے۔ کچھ دن تو وہ بچے کھچے زیور بیچ کر بچوں کا پیٹ پالتی ہے۔ پھر اس خیال سے بمبئی آتی ہے کہ یہاں ہر شئے کی اچھی قیمت مل جاتی ہے۔ وہ اپنے پہچان کے لوگوں کے پاس رہتی ہے۔ دو سال تک کسی نہ کسی طرح گاڑی کھینچتی ہے پھر ضروریات زندگی کے تقاضوں سے مجبور ہو کر تانبے کے برتن فروخت کرنے حیدرآباد جاتی ہے اور ہفتہ بعد لوٹتی ہے تو دنیا بدل چکی ہے اس کے رشتے دار احسان صاحب اس کی بڑی لڑکی معصومہ کو تحائف اور کپڑوں سے لاد دیتے ہیں۔ بیگم صاحبہ کو بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ تحفے احسان صاحب کے دوست سیٹھ احمد بھائی نے دیے ہیں جو احسان صاحب کے فینانسر ہیں۔ رفتہ رفتہ احسان صاحب سمجھانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ احمد بھائی معصومہ کو چاہتے ہیں۔ دراصل احسان صاحب فلم بنانے کے لئے فینانسر پھانستے ہیں اس کے لئے وہ فینانسر کو لڑکیاں سپلائی کرتے ہیں۔ بیگم صاحب کو بھی وہ کچھ اس طرح مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ معصومہ کا سودا کرنے تیار ہو جاتی ہیں اور معصومہ کو بھی یہ سمجھانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں کہ اسی کی کمائی سے گھر کے اخراجات پورے ہو سکتے ہیں۔ معصومہ ان کی بات سن لیتی ہے اور پھر سیٹھوں کے ہاتھ میں کھلونا بن جاتی ہے۔ پہلے احمد بھائی، پھر سورج مَل اس کے بعد راجہ صاحب، کرنل صاحب کے ہاتھوں میں پہنچتی ہے۔ اس کے بعد معصومہ نیلوفر بن کر باضابطہ اپنے فلیٹ میں پیشہ کرنے اور کروانے لگتی ہے گھر کی خوشحالی نیلوفر کی وجہ سے ہے اپنی بہن زبیدہ کی شادی دھوم دھام سے کرتی ہے پھر بھی اس کا میاں اسے طعنے دیتا ہے کہ وہ رنڈی کی بہن ہے۔ ناراض رہتا ہے نیلوفر اس کا منہ تحفوں سے بھر دیتی ہے۔ حلیمہ کی شادی معمولی شکل وصورت کی ہونے کی وجہ سے نہیں ہو پاتی لیکن وہ نیلوفر کو ذمہ دار سمجھتی ہے۔ اس کے بھائی سلیم کو پیشہ ور عورت کا بھائی ہونے کا طعنہ دیتے ہیں وہ سلیم کو تحفوں سے مناتی ہے۔ سب اس کا استحصال کرتے ہیں اس کے پیسے پر عیش کرتے ہیں اس کے خوابوں کا خون کرتے ہیں لیکن اس کے کرب کو نہیں محسوس کرتے اس سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن وہ مرد جنھوں نے نیلوفر کو اس مقام پر پہنچایا ان سے کوئی نفرت نہیں کرتا۔ سماج میں وہ باعزت

زندگی بسر کرتے ہیں۔ عصمت نے مردانہ سماج کے دوغلے پن کو فن کارانہ انداز میں واضح کیا۔ اس سماج میں گناہ کرنے والی عورت کو بدکار کہا جاتا ہے لیکن گنہ گار مرد کو بدکار نہیں سمجھا جاتا۔ ان کی نسائی حسیت تڑپ اٹھتی ہے جوان لڑکیوں کا استحصال جس طرح سے مرد کرتے ہیں اس پر شدید احتجاج کرنے کے بجائے ایک عورت ہونے کے ناطے ان کا جی چاہتی ہے کہ اپنی جوان لڑکی کو دوبارہ اپنی کوکھ میں چھپالے کیوں کہ یہی سب سے محفوظ جگہ ہے۔ پورے ناول میں انہوں نے واقعات کو سماجی اقدار کو ایک عورت کی نظر سے دیکھا اور سوچا۔ جسم فروشی کے خلاف ایک عورت کا دردمند دل تڑپ اٹھتا ہے۔

عصمت کے دوسرے ناولوں اور افسانوں کی طرح اس ناول کی راوی بھی ایک عورت ہے جو اپنے فلیٹ سے نیلوفر کے فلیٹ کی زندگی دیکھتی ہے۔ تکنیکی اعتبار سے یہ سب سے بڑی خامی ہے کہ راوی خاتون معصومہ یا نیلوفر کے بیڈروم کے واقعات بھی بیان کرتی ہیں جہاں نیلوفر اور دوسرے مرد کے علاوہ کوئی نہیں ہوتا۔ تکنیکی خامی سے قطع نظر ''معصومہ'' نسائی حسیت کا ایک اہم ناول ہے۔ عصمت نے پورے سماج اور معاشرے کو عورت کے نقطہ نظر سے دیکھا اور اسی سماج کو مرد کس انداز سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اس کا بھی تجزیہ کیا۔ معصومہ میں دو نسوانی کردار اہم ہیں۔ ایک تو مرکزی کردار معصومہ ہے دوسرا معصومہ کی ماں بیگم صاحبہ ہے۔ اس مردانہ سماج میں وہ صرف مرد کو ہی عورت کا استحصال کرتا نہیں دکھاتیں بلکہ عورت بھی عورت کو استحصال کرتے ہوئے دکھاتی ہیں۔

مردانہ سماج میں عورت اپنی مرضی سے آزادانہ زندگی نہیں گزار سکتی۔ مرد کے سہارے کے بغیر زندگی گذارنا کتنا دشوار ہے۔ اس کا احساس بیگم صاحبہ کے کردار کے ذریعے ہوتا ہے۔

بیگم صاحبہ کا تعلق جاگیردارانہ طبقے سے ہے۔ اس طبقے کے افراد کو تنگی و ترشی سے زندگی گذارنے کی عادت نہیں۔ انہوں نے کبھی کسی کو محنت کرتے بھی نہیں دیکھا البتہ لڑکیوں کے سودے ہوتے ہوئے ضرور دیکھا جہاں لڑکیوں کو پیسے کی خاطر بوڑھے نوابوں

سے بیاہ دیا جاتا ہے جہاں دھڑلے سے عشق کئے جاتے ہیں اور پھر شادی کسی شریف شخص سے کی جاتی ہے۔ عزت و شرافت کا پیمانہ دولت ہے۔ بیگم صاحبہ جب بمبئی آتی ہیں محنت مشقت کرنے کی بجائے زیورات اور برتنوں پر انحصار کرتی ہیں۔ کسی طرح آسائشوں کو ترک کرنا نہیں چاہتی۔ جب ساری پونجی ختم ہو جاتی ہے تو وہ احسان صاحب کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن کر اشاروں پر ناچتی ہیں۔ انہیں صرف دولت چاہیے۔ آرام دہ زندگی چاہیے۔ جب انہیں اطلاع ملتی ہے کہ ان کے میاں نے ایک بیس برس کی لڑکی سے نکاح کر لیا ہے تو وہ ٹوٹ جاتی ہیں۔ جب سہارے ختم ہو جاتے ہیں تو احسان صاحب انہیں معصومہ کی جوانی کی طرف متوجہ کرتے ہیں جس کے ذریعہ وہ پھر سے خوشحال زندگی بسر کر سکتی ہیں۔

احسان صاحب احمد بھائی سے تعارف کرواتے ہیں ۴۵ برس کے احمد بھائی کو دیکھ کر بیگم صاحبہ دہل جاتی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ احمد بھائی معصومہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں احسان صاحب سمجھاتے ہیں کہ احمد بھائی نکاح نہیں کر سکتے کیوں کہ ان کے خسر بارسوخ آدمی ہیں بیگم صاحبہ سخت برہم ہوتی ہیں۔ احسان صاحب اپنے انداز بدل دیتے ہیں۔ ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔ مالی مشکلات منہ پھاڑے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ گھر کا باورچی تک آنکھیں دکھانے لگتا ہے۔ بیگم صاحبہ معصومہ کو فلموں میں کام دلوانے کی کوشش کرتی ہیں لیکن کوئی گھاس نہیں ڈالتا۔ قرض بڑھتا جاتا ہے۔ مکان دار تقاضہ کرنے لگتا ہے بچوں کے نام اسکول سے کٹ جاتے ہیں اسٹیڈیو کی خاک چھانتے چھانتے جوتے گھس جاتے ہیں۔ شوہر کے نکاح کی خبر آتی ہے۔ بیگم صاحبہ حالات سے لڑنے کی بجائے حالات کے آگے سپر ڈال دیتی ہیں۔ وہ کچھ شرائط کے ساتھ احسان صاحب کی بات مان لیتی ہے۔ عصمت کی نسائی حسیت یہ مشاہدہ کرتی ہے کہ اس معاشرے میں مرد ہی عورت کے مخالف نہیں بلکہ عورت بھی عورت کا استحصال کرتی ہے احسان صاحب کی بات مان کر بیگم صاحبہ سوچتی ہیں کہ اس طرح انہوں نے اپنے شوہر کا بدلہ لے لیا کہ ادھر وہ کسی انیس برس کی لڑکی کے ساتھ عیش کر رہا ہے ادھر اس کی اسی عمر کی بیٹی کے دام لگ رہے ہیں جب بڑے میاں کو خبر ملے گی

کہ صاحبزادی نے دھندا شروع کر دیا ہے تو مزہ آجائے گا۔عورت کی اسی فطرت کے بنا پر اسے ناقص العقل کہا جاتا ہے۔ایک طرف بوڑھا انیس برس کی لڑکی کے ساتھ عیش اڑا رہا ہے کیوں کہ مردانہ سماج اس کو اس کی اجازت دیتا ہے۔وہی مردانہ سماج ایک لڑکی جسم فروشی پر مجبور کر رہا ہے کیوں کہ عورت کی جو شئے اس مردانہ سماج میں مہنگے داموں میں فروخت ہوتی ہے وہ اس کی عفت و عصمت ہے— عصمت چغتائی نے ایک طرف بیگم صاحبہ کے وہ جذبات پیش کئے جو ایک چوٹ کھائی ہوئی عورت کے ہیں جسے اس کے شوہر نے تنہا چھوڑ دیا اس سے اس کے بڑے لڑکے بھی چھین لئے اور خود عیش کر رہا ہے۔دوسری طرف یہی عورت ایک ماں بھی ہے۔اور ماں ہونے کے ناطے وہ اس شدید کرب میں مبتلا ہے کہ وہ اپنی بیٹی سے کیسے کہے کہ وہ اپنا جسم ۴۵ برس کے سیٹھ کو پیش کرے اور اپنی جوانی کے دام وصول کرے —— جس معاشرے سے بیگم صاحبہ کا تعلق تھا وہاں سب کچھ ہوتا تھا لیکن جسم فروشی بہرحال معیوب سمجھی جاتی تھی۔وہ احسان صاحب کے سامنے حامی تو بھر لیتی ہے لیکن ساری رات سو نہیں پاتی۔کئی بار وہ اپنی بیٹی کے بستر تک جاتی ہے جو اپنے کنوارے سینے میں سپنے سجائے میٹھی نیند سو رہی ہے۔کئی بار وہ سوچتی ہے کہ اسے جگا کر سینے سے لگا کر سمجھائے مگر کیا سمجھائے۔

"ساری عمر تو یہی تلقین کی بیٹی عورت کا زیور اس کی عزت ہے جان جائے پر عصمت پر بال نہ پڑے۔آج اسے کیوں کر کہے کہ تیرے سوا زندگی کا کوئی سہارا نہیں۔ تجھے قربانی دینی ہوگی چھوٹے بہن بھائی کی ناؤ پار لگانے کے لئے پتوار بننا ہوگا" [1]

ساری رات وہ اسی کشمکش میں روتی رہتی۔عصمت نے ایک ماں کے جذبات بھی پیش کئے اور ایک ایسی عورت کو بھی عریاں کیا جو آسائش کی عادی ہے اور آسائشوں کے لئے وہ اپنی بیٹی کو جسم فروشی کے لئے تیار کرنے کے بارے میں سوچتی ہے۔محنت مزدوری کر کے بچوں کا پیٹ پالنے اور روکھی سوکھی کھانے کی طرف اس کا دھیان ہی نہیں جاتا۔اس کے

---

[1] معصومہ۔ ص۔۲۳۔۲۴

سامنے ایک ہی سوال ہے کہ بیٹی کو عصمت لٹانے کی ترغیب کیسے دے۔ صنعتی شہروں میں لڑکیوں کو کس طرح جسم فروشی کی راہ پر لگایا جاتا ہے اس کو عصمت نے بے نقاب کیا۔ احسان صاحب کے مشورے پر بیگم صاحبہ عمل کرتی ہیں۔ اسکیم کے مطابق وہ سلیم اور دونوں لڑکیوں کو سرِ شام احسان صاحب کے یہاں بھیج دیتی ہیں معصومہ بھی جانے کی ضد کرتی ہے تو بیگم اسے ڈانٹ دیتی ہیں۔ احسان صاحب کی لڑکیاں بچوں کو اپنے پاس روک لیتی ہیں جب احسان احمد بھائی کے ساتھ فلیٹ میں داخل ہوتا ہے تو بیگم کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ ایسا محسوس کرتی ہیں جیسے بیٹی کی بجائے ان کی عزت لٹنے جا رہی ہو۔ وہ خود بہانہ کر کے باہر چلی جاتی ہیں۔

اس مردانہ سماج کے خلاف انہیں خوب غصہ آتا ہے وہ سوچتی ہیں کہ عورت آٹے کی بوری یا گھی کا کنستر نہیں ہے جسے پیسے سے خریدا جائے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ احمد بھائی کے منہ پر تھوک دے۔ عصمت کی نسائی حسیت نے اس معاشرے میں سانس لیتی ہوئی عورت کی فطرت کے تضاد کو پیش کیا۔ ایک طرف وہ اپنی جوان معصوم بیٹی کو ان بھیڑیوں کے آگے بے یار و مددگار تنہا چھوڑ آئی ہے۔ دوسری طرف اسے غصہ ہے اس معاشرے پر۔ ایک طرف وہ معاشرے کے ان گھناؤنی افراد کی مدد کر رہی ہے دوسری طرف خود کو مجبور اور بے بس بھی سمجھ رہی ہے۔ ضمیر کی آواز کو تھپک تھپک کر سلاتی جا رہی ہے اور اس سارے حالات کا ذمہ دار خود کو نہیں سمجھتی۔ بیگم صاحبہ کا یہ فیصلہ غلط سہی لیکن عصمت کی نسائی حسیت بیگم صاحبہ کے درد کو اجاگر کرتی ہے جو وہ بطور ماں محسوس کر رہی ہیں۔ اس بھرے شہر میں وہ خود کو تنہا محسوس کر رہی ہیں۔ اسے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے گھر میں کوئی نہیں پورے محلے میں کوئی نہیں بمبئی میں کوئی نہیں، دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ وہ سڑک پر بلا سوچے سمجھے دور تک چلی جاتی ہے۔ اسے سمندر سسکیاں بھرتا نظر آتا ہے وہ دونوں مٹھیوں میں ریت بھینچ کر روتی ہے۔ اپنی چیخوں کا گلہ گھونٹتی ہے۔ اور سوچتی ہے کہ دنیا کو اس کا احساس ہی نہیں کہ وہ کتنی اکیلی ہے۔ عصمت کی نسائی حسیت بیگم صاحبہ کے کردار میں اس مردانہ سماج کے استحصال کی

تصویر پیش کرتی ہیں جہاں اقدار، اصول سب کھوکھلے ہو جاتے ہیں اور مرد اپنی من مانی کرتا ہے۔ بیگم صاحبہ مرد کے خلاف، نکاح کی رسم کے خلاف مرد کے خلاف احتجاج کرتی ہیں۔

"لعنت ہے یہ نکاح پر کیا دھرا ہے نکاح میں؟ ان کا نکاح بھی تو بڑے قاضی صاحب نے پڑھایا تھا جو بوڑھے رئیس کے لاتعداد نکاح پڑھا چکے تھے آج وہ نکاح ریت کے ذروں سے بھی زیادہ بے حقیقت ہو چکا تھا" [1]

مردانہ سماج میں مرد نے مذہبی احکام کو جس طرح مذاق بنایا ہے نکاح کی آڑ میں وہ کمسن لڑکیوں کے ساتھ جس طرح عیش کرتا ہے اس کے خلاف ایک عورت احتجاج کرتی نظر آتی ہے۔ احسان کی جوان بیٹیاں ہیں۔ احمد بھائی کی جوان بیٹیاں ہیں۔ اپنی بیٹیوں کی عمر کی لڑکی کی احسان دلالی کر رہا ہے اور اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی سے احمد بھائی ہوس مٹانا چاہتا ہے۔ مردانہ سماج کا یہ کیسا تضاد ہے۔ کیوں مرد کو من مانی کرنے کی اجازت ہے۔!

عصمت چغتائی جسم فروشی کے مسئلے کو اقتصادی مسئلہ سمجھتی ہیں۔ مرد کے ہاتھوں میں اقتصادی طاقت ہے۔ اسلئے عورت مجبور ہے وہ اس مردانہ سماج میں وہی چیز فروخت کرنے پر مجبور ہے جس کے دام مرد زیادہ سے زیادہ دینے کو تیار ہے۔ عورت اگر اس راہ پر نہ چلے تو مردانہ سماج میں دوسری راہ کانٹوں بھری ہے۔ اس لئے بیگم صاحبہ جیسی عورتیں پہلے راستے کو ترجیح دیتی ہیں لیکن عورت ہونے کے ناطے ان کا پورا وجود اس مردانہ سماج کے خلاف احتجاج بھی کرتا ہے۔ ضمیر اور اقتصادی پریشانیوں کے درمیان سخت کشمکش ہوتی ہے۔ ایک وقفے کے بعد وہ گھر لوٹتی ہیں تو انہیں معصومہ کی چیخ سنائی دیتی ہے معصومہ اس سے چمٹ جاتی ہے اس کا گریبان تار تار ہے بال نچے ہوئے ہیں ریشمی گردن پر کھرونچوں کے نشان ہیں کان کی لو سے خون بہہ رہا ہے جیسے اسے بھوکے کتوں نے بھنبھوڑا ہو۔ اپنی ماں کو دیکھ کر معصومہ کی ہمت بندھتی ہے وہ اس واقعے کو اتفاق سمجھتی ہے کیوں کہ اسے ماں کی سازش کا علم نہیں ہے وہ بیگم صاحبہ جو اس معاشرے کو مردوں کو قصوروار سمجھ رہی تھیں خود کو تنہا

---

[1] معصومہ ص۔ ۳۱

سمجھ رہی تھیں اپنے حالات پر آنسو بہا رہی تھیں اچانک کینچلی بدل دیتی ہے۔ معصومہ کو صاف بچتے دیکھ کر بجائے اس کے وہ اسے سینے سے لگا لیتیں، خدا کا شکر ادا کرتیں اور سیٹھ کے پیسے اس کے منہ پر پھینک دیتی کہتی ہیں: ''چپ بدمعاش کی بچی، غضب خدا کا گھر وا کر کے رکھ دیا اب تیرے باوا ابھریں گے'' اور بٹوہ سینے سے لگا لیتی ہیں جس میں احمد بھائی کا دیا ہوا پیسہ ہے۔ وہ ماں جس نے گھڑی بھر پہلے اپنی بچی کی سلامتی کی دعائیں مانگتی ہے نوٹوں کی سرسراہٹ سے سہم جاتی ہے اور سوچتی ہے کل اسے روپیہ واپس کرنا ہوگا۔ احسان صاحب روپیہ واپس لینے کی بجائے ان سے کہتے ہیں کہ تم ماں ہو اسے سمجھا سکتی ہو تو وہ شدید الجھن میں پڑ جاتی ہیں۔ عصمت کی نسائی حسیت نے اس تضاد کو پیش کر کے سماج پر بھرپور طنز کیا ہے حالات نے کتنی جلدی بیگم صاحبہ کا رویہ بدل دیا۔ جو لڑکیوں کو سمجھاتی تھیں کہ اے پاشا ڈوپٹہ سر پہ ڈالو یوں ننگے سر پھرتے — شریف بہو بیٹیاں! لڑکیوں کو اونچی آواز میں بات کرنے سے منع کرتیں کہ غیر مردوں کے کانوں میں آواز جاتی ہے —'' لیکن انہیں زیادہ وقت نہیں ہوتی۔ معصومہ سمجھ جاتی ہے۔ جب بیگم صاحبہ اس سے کہتی ہیں ''کتنا کچھ کر رہے ہیں اپن لوگوں کے لئے ڈھائی سو روپیہ کرایہ ہے اس بنگلے کا۔''

''تو وہیں چلئے نا۔ وہاں ستر روپیہ تھا'' معصومہ کہتی ہے

''ہوں اور وہ ستر کون دے گا'' انھوں نے سمجھایا اور معصومہ نے سمجھ لیا۔

مالی مشکلات پر قابو پانے آسائش کی زندگی بسر کرنے کے لئے اور بیٹی دونوں حالات سے سمجھوتا کر لیتی ہیں۔ عصمت چغتائی کی نسائی حسیت اس مسئلے کو اس طرح محسوس کرتی ہے کہ عورت کی جسم فروشی کا ذمہ دار صرف مرد ہی نہیں عورت بھی ہے۔ معصومہ نیلوفر بن جاتی ہے اور بیگم صاحبہ کے نوابی ٹھاٹ لوٹ آتے ہیں۔

مردانہ سماج نے عورت کو سست، کاہل، آرام پسند، عیش پسند اور بے عمل بنا دیا ہے۔ وہ خود کو بے بس ظاہر کر کے دوسروں کو قصوروار ٹھہراتی ہے۔ مردانہ سماج میں مرد نے عورت کو نمائش کی چیز بنا دیا ہے وہ عورت کی اداؤں، ناز نخرے، عشوطرازیوں سے متاثر ہوتا

ہے اور اسے اس کے دام دیتا ہے اس لئے دولت کمانے کا سب سے آسان ذریعہ بعض عورتوں نے عصمت فروشی کو سمجھ لیا ہے۔ عورت اس معاشرے میں اپنی ہستی کا مول جانتی ہے۔ بیگم بھی محنت مزدوری کرنے اور پسینہ بہانے کی بجائے لڑکی کی کمائی کھانے کو ترجیح دیتی ہیں۔ وہ ایک ایسی عورت ہے اور ایسے طبقے سے ان کا تعلق ہے جہاں شوہر کے علاوہ دوسرے مردوں سے تعلق رکھنا برا نہیں سمجھا جاتا اس لئے وہ پہلے احسان صاحب سے تعلقات رکھتی ہیں اور جب احسان صاحب پھکڑ ہو جاتے ہیں تو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ ان کے اور احسان صاحب کے تعلقات بھائی بہن جیسے ہیں۔ جب ان کے پاس دولت کے ریل پیل بڑھ جاتی ہے تو ان کے انداز بدل جاتے ہیں وہ گہرا میک اپ کرتی ہیں بال سیٹ کرواتی ہیں خضاب لگاتی ہیں چست لباس پہننے لگتی ہیں رفتہ رفتہ وہ ماڈرن سوسائٹی کی نائیکہ بن جاتی ہیں۔

بیگم صاحبہ ایک ایسی عورت ہیں جن کا ضمیر مر چکا ہے جو اپنے عیش و آرام کے لئے کچھ بھی کر سکتی ہیں ان کے ہاں نیکی اور بدی کا کوئی تصور نہیں حالات انہیں بے غیرت بھی بنا دیتے ہیں۔

دوسری عورت جو اس معاشرے کے استحصال کا شکار ہوتی ہے اور اس سماج کو اپنی نظر سے دیکھتی ہے اور جو اس ناول کا مرکزی کردار ہے وہ معصومہ ہے۔ معصومہ حالات کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کا باپ اسے چھوڑ کر پاکستان چلا گیا ہے۔ اس کے بڑے بھائی بھی باپ کے ساتھ جا چکے ہیں۔ اس کی ماں پہلے تو زیورات گھر کے برتن وغیرہ فروخت کرتی ہے پھر اسے جسم فروشی پر آمادہ کرتی ہے۔ معصومہ گھر کی بڑی لڑکی ہے۔ اس کا قصور یہ ہے کہ وہ جوان ہے۔ مردانہ سماج اسے اس کے جسم کی قیمت دیتا ہے۔ اس کے بہن بھائی چھوٹے ہیں اس کی ماں کے جسم کا اس سماج میں کوئی مول نہیں۔ اس کی ماں محنت مزدوری کرنے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتی — ایسے حالات میں اس پورے گھر کی ذمہ داری معصومہ پر ہے۔ معصومہ ایک نوعمر لڑکی ہے۔ زندگی کے بارے میں اس کا رویہ سنجیدہ نہیں وہ مسائل کا گہرا

مطالعہ نہیں کرتی اور نتائج پر غور کرتی ہے۔ حالات کے دھارے پر بہتی چلی جاتی ہے دوسروں کے اشارے پر کٹھ پتلی کی طرح ناچتی ہے۔ وہ اپنی ماں اور احسان صاحب کی سازش کا شکار ہوتی ہے۔ ابتداء میں وہ اپنی عصمت کو بچالیتی ہے اور پوری طرح مدافعت کرتی ہے۔ لیکن جب ماں اس کے سامنے مالی مشکلات رکھتی ہے تو وہ اس کی بات مان لیتی ہے اس میں حالات سے لڑنے کا عزم نہیں ہے۔ زندگی سے پنجہ لڑانے کا حوصلہ نہیں ہے۔ وہ اپنی عصمت کی اہمیت سے واقف نہیں۔ وہ خود کو یہ سمجھالیتی ہے کہ اس نے اپنی سکت بھر مدافعت کرلی۔ اسے خوبصورت کپڑوں اور زیورات کا شوق ہے۔ وہ معصومہ سے نیلوفر بن جاتی ہے۔ جب اسے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ مردانہ معاشرے میں عورت کے حصول کے لئے مرد کتوں سے بدتر ہوجاتا ہے۔ تو وہ اپنی بے عزتی کا ان مردوں سے بدلہ لیتی ہے۔ اذیت پسند ہوجاتی ہے۔ احمد بھائی کو گالیاں دیتی ہے بلی کی طرح پنجے مارتی ہے۔ انہیں کتے کی طرح بھونکنے کا حکم دیتی ہے۔ جوتا پھینک کر حکم دیتی ہے کہ ہاتھوں پیروں کے بل چل کر بھونکو پھر جوتا اٹھا کر لاؤ پھر بھونکو اور جوتا پہناؤ۔ انہیں گدھے کی بولی بولنے کو کہتی ہے۔ اور احمد بھائی کے پیٹ میں ایسی لات مارتی ہے کہ انہیں پندرہ دن ہسپتال میں گذارنا پڑتا ہے۔ وہ احمد بھائی کے بعد سورج کے ہاتھوں میں پہنچتی ہے اور اس کی بچی کی ماں بن جاتی ہے۔ سورج مل اسے ٹیکسی ڈرائیور کے حوالے کر دیتا ہے پھر وہ راجہ صاحب کے ہاتھوں میں پہنچ جاتی ہے وہاں سے کرنل صاحب تک وہ ایک لمبا سفر طے کرتی ہے۔

معصومہ کو اپنے پیشے سے نفرت ہے لیکن اس پیشے کو ترک کرنے کی وہ کوشش نہیں کرتی وہ بے عمل ہے۔ معصومہ جو نیلوفر بن چکی ہے اس کی روح ابھی معصوم ہے۔ پیشہ ور عورتوں کی طرح موقع سے فائدہ اٹھا کر پیسہ بٹورنے زیورات جمع کرنے اور فلیٹ اپنے نام لکھوانے کا شوق نہیں۔ پیشہ ور عورتوں کی طرح نہ تو وہ اپنی آمدنی کا حساب رکھتی ہے اور نہ جسم کی نگہداشت کا اسے شوق ہے۔ اسے اپنی بچی سے بھی پیار نہیں۔ عصمت نے ایک پیشہ ور لڑکی کی نفسیات کا بخوبی مطالعہ کیا ہے۔ جیسے احسان صاحب جب اس سے کہتے ہیں کہ وہ

ڈھل گئی ہے تو وہ بپھر جاتی ہے اور خوف زدہ ہو جاتی ہے کیوں کہ یہی جسم اس کا کل اثاثہ ہے۔اس کے اندر کی عورت مری نہیں وہ بار بار جاگ جاتی ہے۔مگر یہ کیسی ماں ہے جس نے اس کے لئے کچھ نہیں کیا۔نانی نے پال پوس کر بڑا کیا ہمیشہ پھوپھوں، خالاؤں نے سوئٹر بننے فراکس سیں استانیوں نے پڑھایا۔ہاں ماں نے مجبوراً نو مہینے پیٹ میں ضرور رکھا ان کا بس چلتا تو کسی انا پادائی کے پیٹ میں ہی اسے پلواتیں۔بس ان نو مہینوں کا کرایہ وصول کر رہی تھی مع سود کے۔

معصومہ محسوس کرتی ہے کہ صنعتی ترقی نے داشتہ کی حیثیت بھی بدل دی ہے۔یہ داشتہ جاگیر دارانہ معاشرے کی داشتہ نہیں جو محض عیش کرتی تھی۔نئے زمانے کی داشتہ کا صرف جسم ہی نہیں خریدا جاتا بلکہ اس کے ذریعہ انکم ٹیکس بچایا جاتا ہے بڑے بڑے ٹھیکے منظور کروائے جاتے ہیں اس کے ذریعہ رشوت پہنچائی جاتی ہے رشوت میں خود اسے پیش کیا جاتا ہے۔کنٹراکٹ سائن کروائے جاتے ہیں اس کی قیمت قیمتی ہاروں اور ساڑیوں کی شکل میں ادا کی جاتی ہے جب کام پورا ہو جاتا ہے تو یہ عورت کسی اور کو فروخت کر دی جاتی ہے۔ اس معاشرے میں شادی، نکاح، بچے سب ڈھونگ اور ریاکاری بن کر رہ جاتے ہیں معصومہ کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ قانوناً کب وہ احسان صاحب کی بیوی بن گئی۔سورج مل کی لڑکی کب احسان صاحب کی لڑکی بن گئی اور کیسے؟

معصومہ یہ بھی محسوس کرتی ہے کہ اس مردانہ معاشرے میں بعض سرمایہ داروں کو اس بات سے بڑی طمانیت ملتی ہے کہ انہوں نے اونچی سوسائٹی کی مہذب لڑکی کو خراب کیا۔

عصمت نے ایک جسم فروش لڑکی کے روحانی کرب کو محسوس کیا اپنی عمر سے دوگنے ڈھائی گنے مردوں کی عیاشی کا شکار معصومہ نشے کے عالم میں ان مردوں کو 'ابا جانی' کہہ کے پکارتی ہے۔معصومہ ایک ایسی تنہا عورت ہے جس کے درد کو کوئی نہیں سمجھتا ماں اسے سکّے ڈھالنے والی مشین سمجھتی ہے سرمایہ دار بڈھے اس کے جسم کا استحصال کرتے ہیں۔زبیدہ جو اس کی بہن ہے جس کے جہیز کے انتظام کے لئے وہ سرمایہ دار بوڑھوں سے اپنی بوٹیاں

نچواتی ہے وہ بھی اس سے نفرت کرتی ہے۔ حلیمہ جس کے پاس نہ علم ہے نہ حسن اپنے کنوار پن کا الزام معصومہ پر رکھتی ہے۔ سلیم کو جب لوگ رنڈی کا بھائی کہہ کر چڑاتے ہیں تو وہ موٹر سائیکل دلا کر اس کا دل بہلاتی ہے کوئی اس کے روح کے کرب کو نہیں سمجھتا کوئی اسے پیار نہیں کرتا۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ اپنے لئے ایک الگ فلیٹ لے کر اپنے کلیجے کے ٹکڑے کے ساتھ پر سکون زندگی گذارے۔ اس کی شدید خواہش ہے کہ وہ کسی مرد کی داشتہ نہیں بیوی بن کر رہے۔ اس کے دل میں یہ خواہش بھی جاگتی ہے کہ ان سیٹھوں کی بیویاں مر جائیں۔ وہ اس بات پر کڑھتی ہے کہ اس کی قسمت میں بوڑھے مرد ہی کیوں ہے اسے احمد بھائی کے پائریا زدہ دانتوں کی بدبو سورج مل کے ڈکاروں کی سوگندھ برداشت کرنی پڑتی ہے۔ سورج مل اسے ٹیکسی ڈرائیور کے حوالے کر دیتا ہے اور وہ ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ رات گذارنے کے بعد یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ اس نے نچلے طبقے کے ایک فرد کے ساتھ رات گذاری ہے۔ وہ سوچنے پر بھی مجبور ہے کہ دس سال اس پیشے میں بیت گئے دس سال بعد وہ کیا کرے گی کتنی سیڑھیاں اترے گی آخری سیڑھی کے بعد کیا ہوگا؟ بڑھتی ہوئی عمر اور ڈھلتے ہوئے جسم سے وہ خوف زدہ ہے۔

اس کے اندر کی معصومہ کبھی نہیں مرتی۔ اسے اپنی ماں پر غصہ آتا ہے جو اسے سکہ ڈھالنے والی مشین سمجھتی ہے وہ سوچتی ہے ماں اپنی اولاد کی خاطر دنیا بھر کے دکھ اٹھاتی ہے چکی پیس کر، سلائی کر کے بچوں کا پیٹ پالتی ہے وہ سوچتی ہے جب وہ راتوں کو غائب رہتی ہے تو اس کی ماں کیوں فکر مند نہیں ہوتی؟ آخر کسی کو اس کی پاکدامنی اور نسوانیت کی فکر کیوں نہیں؟ کیا وہ عورت نہیں؟ کاش کوئی اسے بے تابی سے پیار کرے اس کے لئے خاندان چھوڑ دے کسی مضبوط بانہوں والے رکھوالے کی آغوش میں چھپ جائے۔ عصمت چغتائی نے اس مردانہ سماج کے اقدار پر سوالیہ نشان لگائے ہیں۔ کیا جسم فروش عورت کو بالکل تنہا رہ جانے کا حق ہے؟ صرف وہی قابل نفرت کیوں؟ اس کا استحصال کرنے والوں سے کیوں نہ نفرت کی جائے سورج مل جیسے بدکار کو دیس سیوک سمجھا جاتا ہے۔ احمد بھائی لڑکیوں کے

سکول میں انعامات تقسیم کرتے ہیں۔ اور بچیوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں انہیں بدکار نہیں سمجھا جاتا۔ راجہ صاحب چناؤ میں کھڑے ہوتے ہیں وہ بدکار نہیں کہلاتے۔ جو دنیا معصومہ کو نیلوفر بناتی ہے وہ بدکار نہیں ہے صرف نیلوفر بدکار ہے وہ نیلوفر جو اپنے خاندان کی پالن ہار ہے ان داتا ہے وہ بدکار ہے۔ ایک ہی فعل پر سماج کا یہ دوہرا سلوک کسی مذہب کی دین نہیں بلکہ مردانہ سماج نے اپنی مرضی کے مطابق اصول وضع کر لیے۔ اس لئے گنہہ گار عورت کا جینا دوبھر ہو جاتا ہے لوگ انگلیاں اٹھاتے ہیں اس سے نفرت کرتے ہیں حقارت سے دیکھتے ہیں اور بڑی شان سے سر اٹھا کر چلتا ہے بلکہ اس سماج میں بڑے فخر سے وہ کہتا ہے کہ کتنی لڑکیوں کی عصمت اس نے برباد کی۔ عصمت چغتائی کی کی نسائی حسیت اس ناول میں پوری شدت سے جاگ گئی ہے۔ سماج کی اس بے انصافی پر وہ مرد کی طرح نہیں بلکہ ایک عورت کی طرح وہ سوچتی ہیں۔ سماج کے استحصال اور عیاروں سے محفوظ رکھنے کے لئے اس عورت کا جی چاہتا ہے کہ اپنی سولہ برس کی جوان لڑکی کو واپس اپنی کوکھ میں چھپا لے کیوں کہ یہ مردانہ سماج جوان لڑکیوں کے لئے زہر ہے یہاں اچھل کود نہیں سکتی آزادی سے اپنی مرضی کے مطابق زندگی نہیں گزار سکتی۔

- عصمت نے اسی سماج کے مردوں کو بھی پیش کیا لیکن ایک عورت کے نقطہ نظر سے۔ بمبئ شہر کے کچھ سرمایہ دار مرد ہیں کچھ ان میں سرمایہ دار بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ''معصومہ'' کے سارے مرد گھناؤنے ہیں اس ناول میں ایک مرد بھی ایسا نہیں جو انسان ہو۔ احسان صاحب ہیں جو معصوم لڑکیوں کو گناہ کی راہ پر لگاتے۔ وہ فلم بنانا چاہتے ہیں اس کے لئے انہیں فینانسر چاہیے اور فینانسر لڑکیوں سے خوش ہوتا ہے اس لئے وہ بیگم جیسی عورتوں کی تلاش میں رہتے ہیں جو لڑکیوں سے پیشہ کروانے تیار ہو جاتی ہیں۔ احسان صاحب کی اپنی بیٹیاں بھی معصومہ کی عمر کی ہیں لیکن ان کا معیار دہرا ہے۔ معصومہ کو گناہ کی راہ پر لگاتے ہوئے کبھی انہیں اپنی بیٹیوں کا خیال نہیں آتا۔ اس مردانہ سماج میں مرد نے خارجی اور داخلی زندگی میں جو الگ الگ معیار بنائے ہیں اسے بے نقاب کیا ہے۔ احمد بھائی، سورج مل اور

راجہ صاحب سب کے سب دوہری زندگی گذارتے ہیں یہ سب بیوی بچے والے ''عزت دار'' لوگ ہیں۔ اپنی بیویوں اور دولت مند سسروں سے گھبراتے ہیں اپنے بزنس کو اور گھریلو زندگی کو الگ الگ خانوں میں رکھتے ہیں لیکن کیا اس کے لئے صرف مرد ذمہ دار ہے؟ عصمت نے یہ دکھایا ہے کہ ان کی بیویاں ان کی عیاشیوں سے خوب واقف ہیں لیکن وہ مصلحت آمیز پردہ پوشی کرتی ہیں۔ یہاں عصمت عورت کی اس کمزور حیثیت کو نمایاں کرتی ہیں جو اس مردانہ سماج نے اسے دی ہے۔ بیوی چاہے مالدار ہو یا بارسوخ وہ مجبور ہے کیوں کہ اگر وہ اپنے شوہر پر سختی کرے گی تو وہ اسے چھوڑ دے گا اور جس عورت کو اس کا شوہر چھوڑ دیتا ہے سماج اسے بُری نظر سے دیکھتا ہے۔ اس لئے وہ سب مجبور ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کے خوف کا بھرم بنا رہے۔ ان مردں کی تسکین بھی عجیب عجیب انداز میں ہوتی ہے مثلاً سورج مل کی بیوی حسین ہے چار بچے ہیں اس کے باوجود منہ کا مزہ بدلنے کے لئے وہ دو چار لڑکیاں رکھتے ہیں۔ شریف خون رکھنے والی لڑکیوں کو خراب کر کے وہ تسکین پاتے ہیں۔ اپنی عیاری سے انہوں نے عیاشی کو کاروبار بنا لیا ہے۔ وہ جتنا پیسہ دیتا ہے رسیدوں پر دستخط کرواتا ہے۔ ایسے معاہدے لکھواتا ہے جس کی رو سے وہ کسی بھی وقت اپنا پورا پیسہ واپس لے سکتا ہے نیلوفر سے جو بچی ہوئی ہے اس کا سارا خرچ اٹھاتا ہے لیکن اسے باپ کا نام نہیں دیتا۔ وہ کچھ ایسا جال پھیلاتا ہے کہ بچی کے باپ کے نام کی جگہ احسان صاحب کا نام موجود ہے۔ ایسے دستاویزی ثبوت ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ معصوم احسان صاحب کی بیوی ہے نکاح نامہ موجود ہے۔ مرد نے مذہبی اور سماجی قوانین کو کھلونا بنالیا ہے اس کی قلعی سورج مل کے کردار سے کھلتی ہے۔ اس نکاح نامہ میں مہر کی رقم بھی درج ہے جو شرعی مہر ہے۔ اس معاشرے میں نکاح اور طلاق مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔ نیلوفر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے ''اور کیا بھگوان کی لیلا ہے۔ اس کی ماں کا یار اس کا قانونی شوہر!

قانون اور شوہر، شوہر اور قانون — سب ایک سڑک کے پتھر ہیں جن سے نیلوفر جیسی بے بس لڑکیوں کو سر پھوڑنا پڑتا ہے۔''

سورج مل جتنی لڑکیاں رکھتا ہے ان کے نام سے کاروبار کرتا ہے۔ اور انکم ٹیکس بچا لیتا ہے۔ اس جدید صنعتی معاشرے میں جذبات کا کوئی دخل نہیں۔ عیاشیاں بھی دور رس نتائج کو ذہن میں رکھ کر منصوبہ بند انداز میں کی جاتی ہیں۔ یہاں یہ سماج جاگیر دارانہ معاشرے سے مختلف ہو جاتا ہے۔

اس میں متوسط طبقے کا ہوٹل منیجر ہے جسے اس بات سے تسکین ملتی ہے کہ اس نے بڑے آدمیوں کی داشتہ کے ساتھ وقت گذارا۔ عصمت نے مرد کے تضادات کو پیش کیا۔ وہ عشق کا دم بھی بھرتا ہے۔ لڑکیوں کے جسم سے لذت بھی اٹھانا چاہتا ہے بیوی بچوں کے ساتھ پرسکون ازدواجی زندگی گذارنے کا بھی متمنّی ہے۔ اپنی مالی حیثیت بھی مضبوط بنانا چاہتا ہے۔

راجہ صاحب ہیں جو بدلتی قدروں کے ساتھ خود بھی بدل گئے ہیں ان کا ذوق اعلیٰ درجے کا ہے سستی اور اوچھی حرکتیں انہیں پسند نہیں جو داشتہ کے ذریعہ رشوت پہنچاتے ہیں اور کبھی راشتہ ہی کو رشوت میں پیش کر دیتے ہیں۔ موقع کی نزاکت سے اسی داشتہ کو سوشیل ورکر بنا دیتے ہیں اور نیک نامی لوٹتے ہیں۔ جب یہی داشتہ معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے۔ ان کی سازشوں کو سمجھنے لگتی ہے تو وہ بھڑک اٹھتے ہیں۔ اور اسے دو ٹکے کی رنڈی کہتے ہیں۔

عصمت نے بڑی خوبی سے مردانہ معاشرے کی جعل سازی ڈھونگ، دوغلہ پن نمایاں کیا ہے۔ اس معاشرے کے مرد ہر بات میں فائدہ اور نقصان تلاش کرتے ہیں۔ اس معاشرے میں جذبات وانسان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ قیمت دو عیاشی کرو۔ دولت، شہرت اور عزت پر آنچ نہ آنے دو۔ جب جی بھر جائے اپنے کام پورے ہو جائیں تو پھر اس عورت کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکو یا ڈرائیور کے حوالے کر دو اسے فروخت کر دو جیسے وہ ذاتی ملکیت ہو۔

عصمت نے صنعتی شہر کے مشینی ومیکانکی ماحول میں ایک بہت ہی نازک مسئلے کو

چھیڑا ہے۔ اسباب تلاش کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ ان کی نسائی حسیت صرف مردوں کو ہی قصوروار نہیں ٹھہراتی بلکہ عورتوں کو بھی ذمہ دار سمجھتی ہے۔ عصمت اصلاح نسواں نہیں کرتیں بلکہ اس گندگی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جس میں معصوم لڑکیاں گلے تک پھنسی ہوئیں ہیں۔ انہوں نے مردانہ معاشرے پر کچھ سوالیہ نشان بھی لگائے ہیں فلم انڈسٹری کی چمک دمک کے پیچھے کتنا اندھیرا ہے اس کی جھلکیاں دکھائی ہیں۔ 'معصومہ' عصمت کا اہم ناول ہے۔ جس میں انہوں نے اپنی نسائی حسیت کا بھرپور اظہار کیا ہے۔

''جنگلی کبوتر'' میں عصمت نے ایک ایسے موضوع کا انتخاب کیا جو ہندوستانی سماج میں عورت کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ میں مردانہ سماج دوہرا معیار رکھتا ہے۔ اس ناول میں عصمت کی نسائی حسیت بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ مرد کو احساس دلانا چاہتی ہیں جس فعل کے لئے مردانہ سماج عورت پر لعن طعن کرتا ہے وہی فعل مرد سے سرزد ہو جائے تو اسے کوئی اہمیت نہیں دی جاتی جو لغزش عورت کی زندگی تباہ کر دیتی ہے وہی اسی لغزش کو مرد اپنا حق سمجھتا ہے۔ عصمت نے بہت ہی نازک مسئلہ چھیڑا ہے۔

ماجد ایک خوبصورت اور فلرٹ نوجوان ہے وہ ان گنت کامیاب و ناکام عشق لڑا چکا ہے۔ لڑکیاں اس پر بری طرح عاشق ہو جاتی ہیں وہ اپنی ایک کزن عابدہ سے شادی کر لیتا ہے وہ عابدہ سے بے پناہ پیار کرتا ہے عابدہ بھی اسے بے انتہا چاہتی ہے لیکن اس کے لاشعور میں یہ بات محفوظ ہے کہ ماجد فلرٹ ہے بدقسمتی سے عابدہ شادی کے دس برس گزر جانے کے بعد بھی ماں نہیں بن سکتی۔ ماجد کی ماں پر فالج کا دوسرا حملہ ہوتا ہے اور ان کی تیمارداری کے لئے چلی جاتی ہے پھر ماجد کی بہن ڈلیوری کے لئے آجاتی ہے۔ ان مسائل کو نمٹانے میں پورے چھ مہینے ہو جاتے ہیں۔ اس دوران ماجد ایک ایسی عورت مونا سے جسمانی تعلقات قائم کر لیتا ہے جو کال گرل ہے اور ایک کینٹین میں کام کرتی ہے یہ سب کچھ محض وقتی طور پر ہوتا ہے۔ نہ کال گرل اس بات کو اہمیت دیتی ہے اور نہ ماجد۔ وہ سمجھتا ہے اپنی بیوی کی غیر موجودگی میں جسمانی تقاضوں سے مجبور ہو کر اگر اس نے ایسا کیا تو عین

فطرت کے مطابق کیا۔ لیکن جب عابدہ واپس ہوتی ہے اور اسے اس بات کا علم ہوتا ہے تو وہ بات کا سنجیدگی سے نوٹ لیتی ہے۔ وہ مونا سے ملتی ہے۔ مونا ماجد کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ وہ عابدہ سے توہین آمیز سلوک کرتی ہے لیکن عابدہ برا نہیں مناتی وہ اس کا خرچ اٹھاتی ہے۔ وہ اسے اپنی سہیلی کے فلیٹ میں رکھتی ہے جہاں مونا ماں بنتی ہے۔ عابدہ نو مولود لڑکی کو اپنانا چاہتی ہے مونا وعدہ خلافی کرتی ہے اور بچی اس کے حوالے نہیں کرتی۔ عابدہ خالی ہاتھ واپس آتی ہے۔ عابدہ اور ماجد کے تعلقات میں دراڑ پڑ جاتی ہے۔ عابدہ، ماجد کو اپنا جسم چھونے نہیں دیتی۔ وہ ماجد سے دور دور رہتی ہے زیادہ تر مائیکے میں رہتی ہے۔ عابدہ، ماجد سے اصرار کرتی ہے کہ وہ مونا سے شادی کر لے کیوں کہ وہ اس کی بچی کا باپ ہے۔ وہ مونا کو پیسہ بھیجتی ہے اس کا ہر مطالبہ پورا کرتی ہے یہاں تک کہ اپنے زیور تک فروخت کر دیتی ہے۔ وہ ماجد کو بے خبر رکھتی ہے۔ ماجد عابدہ کے سلوک سے بڑی نفسیاتی الجھن میں گرفتار ہو جاتا ہے اور بیمار رہنے لگتا ہے۔ بیماری کی وجہ سے اس کی ملازمت چلی جاتی ہے۔ ایک روز وہ چوری سے وہ فائیل دیکھ لیتا ہے جس میں عابدہ نے مونا کو بھیجے گئے پیسوں کا حساب لکھ رکھا ہے۔ وہ ضبط و تحمل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے۔ اسے کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ وہ مونا سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔ عابدہ اس سے کم پر راضی نہیں۔ عابدہ نے اخلاقی شکست دی ہے۔ اتنا شرمندہ کیا کہ وہ خود کو حقیر سا محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ اس کرب کو سمیٹتے ہوئے دنیا سے چلا جاتا ہے۔ آخر میں مونا اپنی لڑکی عابدہ کے حوالے کر دیتی ہے کیوں کہ جس مرد کے ساتھ وہ رہنا چاہتی ہے اسے بچے پسند نہیں ہیں۔

عصمت نے بڑے نازک مسئلے کو چھوا ہے۔ سماج میں مرد وقتی طور پر عورت سے جسمانی تسکین پاتے ہیں اور اس فعل کا معاوضہ (پیسوں کی شکل میں) ادا کر کے یہ سمجھتے ہیں جیسے انہوں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ عصمت یہ احساس دلانا چاہتی ہیں کہ اگر کسی عورت پر بُری نظر ڈالے یا اس کے جسم سے تسکین پائے تو اس کا یہ فرض ہے کہ وہ سماج میں اسے بیوی کا درجہ دے اور اس کا پورا خرچ اٹھائے اس کی ذمہ داریوں کو پورا کرے۔ کیوں کہ عورت کوئی

بکنے والی شئے نہیں ہے۔ عصمت کی نسائی حسیت نے اس مسئلے کو صحیح رخ سے پیش کیا۔ عورت کی عصمت کو مردانہ سماج نے کھلونا بنا لیا ہے۔ دوسری طرف عورت نے جسم فروشی کے گھناونے پیشے کو قبول کر کے اپنی حیثیت گرالی ہے۔ عصمت اپنی نسائی حسیت کے ذریعہ یہ احساس دلانا چاہتی ہیں کہ ''عصمت وعفت'' کے معاملے میں مرد اور عورت دونوں یکساں حیثیت کے حامل ہیں۔ جبکہ مردانہ سماج میں مرد بڑے فخر سے سر اونچا کئے گھومتا اور ساری حقارت اور ذلالت سہنے کے لئے عورت رہ جاتی ہے۔ حالانکہ مختلف مذاہب نے بشمول اسلام زانی مرد اور عورت کے لئے یکساں سزا مقرر کی ہے۔ لیکن ہندوستانی معاشرے میں صرف عورت کی عصمت کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار عورت ہے۔ ایک عورت دوسری عورت کو اس کا حق دلوانے کے لئے اپنی گھریلو زندگی داؤ پر لگا دیتی ہے۔ اردو کا شاید واحد ناول ہے جس میں نسائی حسیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

اس ناول کا مرکزی کردار عابدہ کے ذہن میں یہ بات نقش ہے کہ ماجد فلرٹ ہے۔ وہ ماجد کو چاہتی ہے لیکن ایک نسوانی پندار کے ساتھ۔ عصمت لکھتی ہیں ''ماجد کے عشق میں اسے خدا کا جلوہ نظر آیا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنی دنیا سمیٹ کر اس کے وجود میں ڈبو دی، مگر نسوانی خودداری کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اگر ماجد کو آنے میں دیر ہو جاتی تو وہ بے قرار ڈبڈبائی آنکھوں سے دروازہ تکا کرتی لیکن جب وہ گھر میں داخل ہوتا تو اپنے دل کی دھڑکنوں کو مسل کر بڑی بے تعلق سی بن کر کسی فضول سے کام میں لگ جاتی۔ وہ بے قراری سے اسے اپنی آغوش میں کھینچتا تو وہ ضبط کر کے اس کے جوش پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ڈال دیتی۔''[1]

وہ جانتی ہے کہ عورت اپنا سب کچھ مرد کے قدموں میں ڈال دے تو پھر مرد اس سے بہت جلد اوب جاتا ہے۔ یہ مرد کی فطرت ہے۔ اس لئے عابدہ کی نسائی حس اسے اس بات سے روکتی ہے کہ وہ ماجد کو اپنا سب کچھ سونپ دے۔ عابدہ ایک باشعور عورت ہے۔

---

[1] جنگلی کبوتر: مشمولہ عصمت چغتائی نمبر، دوشیزہ کراچی ص۔ ۲۵

اسے اپنی نسوانیت کے وقار کا پورا احساس وہ عام لڑکی نہیں ہے جو مردانہ سماج کے ہر ظلم کو روایت سمجھ کر برداشت کرلے۔ وہ جذباتی لڑکی بھی نہیں ہے وہ سلجھے ذہن کی عورت ہے اس لئے جب اسے ماجد اور مونا کے تعلقات کا پتہ چلتا ہے تو وہ ماجد کا منہ نہیں نوچتی۔ انتہائی صبر وضبط سے کام لیتی ہے۔ وہ اس ''حادثے'' کو خالص نسوانی انداز میں سوچتی ہے۔ پر تشدد نہیں ہوتی۔ اپنے اخلاق، کچھ پابندیوں اور کچھ محبت کے برتاؤ کے ساتھ وہ ماجد کو یہ احساس دلانے میں کامیاب ہو جاتی ہے کہ ''عصمت'' کے معاملے میں مرد اور عورت دونوں یکساں سزا کے مستحق ہیں۔ مرد کو بالکل آزاد نہیں چھوڑا جاسکتا۔ اس واقعے کے بعد عابدہ کبھی ماجد کو اپنا جسم چھونے نہیں دیتی وہ ایسے لباس زیب تن کرتی ہے کہ ماجد اس کی طرف راغب ہی نہ ہو۔ ایسے طور طریقے اختیار کرتی ہے کہ ماجد کے جذبات پر اوس پڑ جاتی ہے۔ اس معاملے پر جب بھی ماجد سے گفتگو ہوتی ہے وہ یہی اصرار کرتی ہے کہ ماجد، مونا کو اپنالے اور ماجد اس غلطی کی اتنی بڑی سزا پانے کو تیار نہیں۔ عابدہ اس سے پوچھتی ہے۔

''اگر مجھ سے کچھ ایسی غلطی چوک ہو جاتی؟''

''تو بخدا میں تمہاری ہڈیاں توڑ کر رکھ دیتا مگر تمہیں ایک وحشی درندے کے ساتھ رہنے کی سزا نہ دیتا۔'' [1]

یہ مرد کے سوچنے کا انداز ہے وہ عورت کی غلطی کی سزا ہڈیاں توڑ کر دیتا ہے۔ لیکن گوارہ نہیں کرسکتا کہ عورت کسی اور مرد کے ساتھ زندگی گذارے۔ لیکن عورت تشدد پر ایقان نہیں رکھتی۔ وہ ایک عورت کو اس کا حق دلانا چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ مرد نے اگر عورت سے جسمانی تعلق قائم کیا ہے تو پھر زندگی بھر کے لئے اس کا ساتھ نبھائے اسے وقتی طور پر لذت اٹھانے کی شئے نہ سمجھے۔ مرد ہونے کے ناطے ماجد ایک اور تجویز رکھتا ہے۔

''تم جو چاہو سزا دے لو تمہیں مجھ سے گھن آتی ہے تو میں تمہیں تمہاری مرضی کے

---

[1] جنگلی کبوتر ص۔ ۲۷

بغیر ہاتھ بھی نہ لگاؤں گا۔ہم دو دوستوں کی طرح تو رہ سکتے ہیں۔ [1]

لیکن عابدہ اس تجویز کو بھی رد کر دیتی ہے۔ ہندوستانی عورت جس سماج میں سانس لیتی ہے وہاں مرد دوست کا کوئی تصوّر نہیں ہے اور جو مرد شوہر کی حیثیت رکھتا ہے اس کے ساتھ دوست کی طرح رہنا اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔اور ایک عورت ہونے کے ناطے عابدہ ایسی کسی تجویز کو نہیں مانتی۔ ماجد ایک اور تجویز رکھتا ہے۔اقتصادی باگ ڈور چونکہ مرد کے ہاتھ میں ہے۔اس لئے وہ اس سماج میں ہر شئے کا مول پیسے سے کرتا ہے۔عورت کی عصمت کا مول بھی وہ پیسہ ہی سمجھتا ہے۔کیوں کہ مردانہ سماج میں جسم فروشی ایک پیشہ ہے اسے عورت نے مختلف حالات سے مجبور ہو کر قبول کر لیا ہے۔ایک طرف مرد جسم فروشی سے سخت نفرت کا اظہار کرتا ہے۔دوسری طرف اسے پیشے کو قائم رکھنے اور اسے فروغ دینے والا بھی مرد ہے۔

ماجد یہ تجویز رکھتا ہے کہ وہ مونا کی روپے پیسے سے مدد کرے گا۔ماجد یہ سمجھتا ہے کہ اس تجویز کو عابدہ ضرور مان لے گی لیکن عابدہ سماجی حیثیت پر اصرار کرتی ہے۔وہ کہتی ہے۔

''مالی مدد۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم روپے کو اتنی اہمیت دیتے ہو۔کیا مالی مدد سے ہر بات کی تلافی ہو جاتی ہے؟'' [2]

عصمت یہاں سماج پر بھرپور وار کرتی ہیں۔ بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کا حل پیسہ نہیں ہے ایسا ہی ایک مسئلہ عورت کی عصمت کا بھی ہے۔جب عابدہ مونا سے ملنے جاتی ہے تو عصمت کی نسائی حسیت نے دو مختلف الخیال عورتوں کے سوچنے سمجھنے کے ڈھنگ اور جذبات کی عمدہ عکاسی کی ہے۔ عابدہ مونا کو حق دلوانے کے لئے کہتی ہے کہ وہ ماجد سے شادی کر لے۔لیکن مونا کے لئے شادی کوئی اہمیت نہیں رکھتی وہ عابدہ کا مذاق اڑاتی ہے کہ شادی کر کے اسے کون سا تمغہ مل گیا جو اسے ملے گا۔مونا شادی پر یقین نہیں رکھتی۔ عابدہ

---

[1] جنگلی کبوتر ص۔۲۷

[2] جنگلی کبوتر ص۔۲۷

ماں بننا چاہتی ہے لیکن نہیں بن پاتی۔ مونا ماں بننے کو ایک مصیبت سمجھتی ہے لیکن وہ ماں بننے والی ہے۔ عابدہ، عقل، شعور، خاندان اور سماجی حیثیت، ہر اعتبار سے مونا پر فوقیت رکھتی ہے۔ لیکن جو روپ عورت کو مکمل بناتا ہے اس سے عابدہ محروم ہے۔ اور مونا اسی ایک بات پر نازاں ہے۔ اس کے سوچنے کا انداز مختلف ہے۔ وہ مونا سے کہتی ہے۔

''تم بانجھ ہو؟ اس نے ہولے سے کہا'' کتنی خوش نصیب ہو!''

''نصیب اپنے ہاتھ میں تو نہیں''

''تمہیں اپنے شوہر سے نفرت نہیں؟''

''نفرت! نفرت کرنا بھی اپنے بس کی بات نہیں''

''اور مجھ سے۔؟''

''تم سے نفرت کر کے کیا مل جائے گا۔''

''نہ ملے کچھ، بلا سے، لیکن اگر تم نے میرا میاں چھین لیا ہوتا تو میں تمہاری لاش ڈال دیتی۔'' [1]

مونا ایک ایسی لڑکی ہے جس میں نسائی حس نہیں ہے وہ اپنی نسوانیت اور خوبصورت جسم کو ہی کل سرمایہ سمجھتی ہے۔ اس مردانہ سماج میں جس شئے کی سب سے زیادہ قیمت ملتی ہے وہ مونا کے پاس ہے وہ اپنے خوبصورت جسم کے سہارے مرد کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر خوش حال زندگی بسر کرنا چاہتی ہے اس نے مردانہ سماج کے اس گھناؤنے عمل کو قبول کر لیا ہے۔ وہ مرد کو پیسہ دینے والی مشین سمجھتی ہے۔ عورت جسم فروشی کی سب سے بڑی وجہ اقتصادی پریشانی کو سمجھتی ہیں۔ اس پیشے میں عورت کا ماں بننا اس کے پیشے کے لئے مصیبت بن جاتا ہے۔ ایسی عورت بانجھ پن کو خوش نصیبی سمجھتی ہے۔ مونا کو ماجد پر اس لئے غصہ ہے کہ ان حالات کی وجہ سے اس کی صحت، جسم اور آمدنی پر بُرا اثر پڑا ہے وہ کہتی ہے ''میں تو گلا گھونٹ دوں گی کُتے کے پلّے کا'' مونا فیصلہ نہیں کر پاتی کبھی ہونے والے بچے

[1] جنگلی کبوتر ص۔۲۹

سے شدید تنفر کا اظہار کرتی ہے اور کبھی بچے کو عابدہ کے حوالے کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔
مونا کے کردار میں ایک ماں اور پیشہ ور عورت کی کشمکش عصمت چغتائی نے دکھائی ہے۔
ابتداء میں وہ بچے کو عابدہ کے حوالے کرنے کو تیار ہو جاتی ہے لیکن جب وہ ایک بچی کی ماں بن جاتی ہے تو اس کی ممتا جاگ اٹھتی ہے۔ اور پیشہ ور عورت کے مقابلے میں ماں جیت جاتی ہے۔ عصمت یہ بتانا چاہتی ہیں کہ عورت کی جسم فروشی مردانہ سماج کی دین ہے۔ عورت فطرتاً ماں ہوتی ہے۔ کوئی بھی عورت فطرتاً بری نہیں ہوتی سماج میں ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ عورت جسم فروشی کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور اس پیشے کو قبول کرنے کے بعد جذبات اور رشتے مذاق بن کر رہ جاتے ہیں۔ وہ صرف ایک ہی رشتے کو جانتی اور تسلیم کرتی ہے ماجد جب اس سے کہتا ہے کہ میرا اور تمہارا وقتی جسمانی رشتہ تھا تو مونا جواب دیتی ہے کہ ''عورت اور مرد میں کیا اور بھی رشتہ ہوتا ہے؟'' اس کے باوجود وہ اپنے اور ماجد کے رشتے کو گناہ کا رشتہ نہیں بلکہ مقدس رشتہ سمجھتی ہے۔ وہ ماجد سے کہتی ہے۔

''میں جانتی ہوں ۔۔۔ اس نے فلسفیوں کی طرح سرگوشی میں کہا'' میں رنڈی ہوں اگر تمہاری جگہ اس وقت کوئی دوسرا ہوتا تو میں اسے کچا چبا جاتی مگر ۔۔۔ تمہارے معاملے میں میں بھی ادھوری رنڈی ہوں۔'' وہ کھسیانی ہنسی میں رقت کو چھپا رہی تھی۔'' [1]

دوسری طرف عابدہ ہے جسے ماجد کی محبت حاصل ہے لیکن ماجد نے مونا کے جسم کو حاصل کر کے اس کی توہین کی ہے اسے کبھی نہیں بھولتی۔ ایک عورت کے پندار کو ٹھیس پہنچتی ہے ساتھ ہی غیر محسوس طریقے پر وہ احساس کمتری کا بھی شکار ہو جاتی ہے۔ ساری برتر صلاحیتوں کے باوجود وہ جانتی ہے کہ مونا کے جسم میں اس سے زیادہ کشش ہے۔ پھر مونا ماں بن گئی ہے جب کہ وہ تخلیقی صلاحیت سے محروم ہے اور اب ماجد کے بچے کی ماں بننے کا امکان بھی نہیں کیوں کہ وہ ماجد کو اپنا جسم چھونے نہیں دیتی۔

عصمت چغتائی نے اس ناول میں میاں بیوی کے تعلقات کے بعض نازک

---

[1] جنگلی کبوتر ص۔۳۵

گوشوں کو اجاگر کیا۔ شادی کے بندھن کو نئے معنیٰ دیے۔ جب مرد کسی دوسری عورت سے رشتہ قائم کر لیتا ہے تو عورت اس سلسلے میں کس طرح سوچتی ہے۔ یہاں نسائی حسیت کا بھر پور اظہار ملتا ہے۔ عابدہ کہتی ہے۔

''دیکھو مجو سمجھنے کی کوشش کرو۔۔۔ ایک تار کاٹ کر دوسری طرف جوڑ دیا جائے تو کرنٹ کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔۔۔ پھر اگر۔۔۔ دوسری طرف سے پھر تار کاٹ دیا جائے تو فیوز اڑ جاتا ہے تب بہت زور کا شوک لگتا ہے۔ [1]

جسم اور روح و دماغ کے رشتے پر خالص عورت کے انداز میں نظر ڈالتی ہے۔ وہ اس بات پر شدید احتجاج کرتی ہے کہ ہر مرد کا جسم دماغ پر چھایا رہتا ہے۔ اور یہ صدیوں کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ شادی کے بارے میں عصمت کہتی ہیں کہ شادی کسی جذبے کی تسکین کا نام نہیں اس جذبے کی تسکین کا بازار کھلا ہے وہ شادی کو ایک مقدس بندھن سمجھتی ہیں جہاں عورت اور مرد کی ایک دوسرے سے وفاداری پہلی شرط ہے۔ ماجد جب عابدہ سے کہتا ہے کہ وہ مونا جیسی عورت کے ساتھ مل کر اس کے خلاف محاذ بنا رہی ہے تو اس کے اندر کی عورت تڑپ اٹھتی ہے وہ کہتی ہے۔ ''ہم بے چاریاں کیا تمہارے خلاف محاذ بنائیں گی۔ تمہارے پیچھے ہم ایک دوسرے کی گردنیں مروڑتی پھریں۔ تم کہیں ٹھوکر مارتے ہو کہیں ناک رگڑ کر اُلّو سیدھا کر لیتے ہو۔ اچھا میں ایک شرط پر طلاق لینے کو تیار ہوں تم اس سے شادی کر لو بولو منظور ہے؟'' [2]

ایک عورت ہونے کے ناطے اس ناجائز لڑکی کے مستقبل کے بارے میں سوچتی ہے۔ اور مردانہ سماج کے نمائندے ماجد سے پوچھتی ہے۔ ''ماجد صاحب آپ نے کبھی بھولے سے یہ بھی سوچا کہ جب بھی رٹی جوان ہوگی تو وہ اپنے بارے میں کیا فیصلہ کرے گی جب ایک ایک کر کے مونا کے تمام عاشق کل کی بات ہو جائیں گے تو وہ بیٹی کو بھی وہی راستہ

---

[1] جنگلی کبوتر ص۔۳۷

[2] جنگلی کبوتر ص۔۴۲

دکھانے پر مجبور ہو جائے گی جس پر وہ بھٹک چکی ہے میں اطمینان سے گھر بار سجائے بیٹھی ہوں گی اور میرا ضمیر مجھ سے کچھ سوال نہ کرے گا۔۔۔'' [1]

عصمت نے نا جائز لڑکیوں کے مستقبل، جسم فروش عورتوں کے انجام کے بارے میں مردانہ سماج کی توجہ دلائی ہے۔ ایک عورت ہونے کے ناطے عابدہ کا ضمیر اس سے سوال کر رہا ہے کہ اس کے شوہر کی ہوس کا شکار ہونے والی اس عورت کا مستقبل کیا ہوگا۔ جب اس کا جسم ڈھل جائے گا اور جوانی ختم ہو جائے گی تو پھر وہ کیسے جئے گی۔ پھر تو وہ لڑکی کے جواں جسم کی کمائی کھائے گی اس طرح یہ سلسلہ نسل در نسل دراز ہو جائے گا جس کا ذمہ دار مرد ہے اور مردانہ سماج ہے۔

اس مردانہ معاشرے کی نمائندگی ماجد کر رہا ہے وہ ایک خوش حال گھرانے کا فرد ہے۔ شادی اپنی پسند سے کرتا ہے اور اپنی بیوی سے بے پناہ پیار بھی کرتا ہے اس کے جذبات و احساسات کی قدر کرتا ہے وہ فلرٹ ہے لیکن بد کردار نہیں ہے۔ چھ مہینے تک اپنی بیوی سے دور رہنے کی وجہ سے وہ ایک لغزش کا شکار ہو جاتا ہے وہ اسے لغزش ہی نہیں سمجھتا کیوں کہ جس ماحول میں اور جس سماج میں وہ رہتا ہے وہاں یہ ایک معمولی سی بات ہے۔ اس مسئلہ کی سنگینی کو محسوس نہیں کرتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ عابدہ نے معمولی سی بات کا مسئلہ کھڑا کر دیا اور رائی کو پربت بنا دیا۔ وہ اس بات کو سمجھ نہیں پاتا کہ کیوں عابدہ اسے مونا کو اپنا لینے کی ضد کر رہی ہے کیوں کہ اس کے خیال میں ''اگر کوئی رفع حاجت کے لئے موتری میں داخل ہو جائے تو پھر اسے وہیں قید کر دینا چاہیے اور کیا وہ وہاں ساری عمر رہ سکتا ہے۔'' اسے اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ کوئی فرشتہ نہیں ہے۔ کمزور انسان ہے۔ جس سماج میں وہ رہتا ہے وہاں ایسی کمزوری پر کوئی سزا نہیں دی جاتی لیکن عابدہ اسے سزا دیتی ہے تو وہ احتجاج کرتا ہے۔ عصمت نے ماجد کو مردانہ سماج کے ایک عام انسان کی علامت بنا کر پیش کیا۔ مرد ہونے کے ناطے وہ اس طرح کی لغزش کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ زیادہ سے زیادہ اس غلطی کا خمیازہ

---

[1] جنگلی کبوتر ص۔۴۲

معاوضے کی صورت میں ادا کرنا چاہتا ہے۔ لیکن عابدہ اسے اس مسئلے کی سنگینی کا احساس دلاتی ہے۔ اپنے گناہ کی آگ میں وہ جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔ عابدہ کے آگے اسے اپنا قد بہت چھوٹا نظر آتا ہے وہ بیمار ہو کر موت کو گلے لگا لیتا ہے۔

عصمت کا یہ ناول عورت کی جسم فروشی کے خلاف ایک احتجاج ہے۔ اس میں مرد ہی نہیں مونا جیسی عورت بھی برابر کی ذمہ دار ہے۔ جس نے اقتصادی مسائل کو نمٹنے کے لئے جسم بیچنے کا پیشہ اختیار کیا۔ عصمت نے اس سارے مسئلہ کو ایک عورت کی نظر سے دیکھا محسوس کیا انہوں نے مرد کے احساس برتری، گناہ کو وقتی ضرورت سمجھنا اور جواز پیش کرنے اور ناجائز بچوں کے مستقبل کے بارے میں سوال اٹھائے ہیں۔ جنگلی کبوتر عصمت کی نسائی حسیت کا ایک اہم ناول ہے۔ ان ناولوں کے علاوہ عصمت نے سودائی، دل کی دنیا، عجیب آدمی اور ایک قطرۂ خون بھی لکھے۔ 'سودائی' پر فلم بزدل بنائی جا چکی ہے اس میں ڈرامائی اور فلمی انداز ہے۔ اس ناول کی ادبی حیثیت مشکوک ہے کیوں ایک فلم کے تقاضوں میں عوامی پسند بھی شامل ہوتی ہے اور باکس آفس پر کامیابی بھی۔ اس لئے اس ناول میں وہ معیار نہیں ملتا جو اسے ادبی ناول بنائے۔ 'عجیب آدمی' فلمی ہدایت کار گرودت کی زندگی پر لکھا گیا ہے اس کا مرکزی کردار مرد ہے اور ماحول فلمی۔ اس مصنوعی ماحول میں عورت کا نقطہ نظر اس دنیا کے بارے میں کیا ہے وہ واضح نہیں ہوتا۔ 'ایک قطرۂ خون' عصمت نے انیس کے مرثیوں کو سامنے رکھ کر واقعاتِ کربلا پر لکھا ہے۔ اس طرح نسائی حسیت کے اعتبار سے اہم ناولوں کا جائزہ پیش کیا گیا۔

☆☆

ساتواں باب

عصمت چغتائی کے افسانوں میں نسائی حسیت

عصمت چغتائی جدید اردو افسانے کے عناصر خمسہ میں سے ایک ہیں۔ پریم چند کے بعد جو اہم اور بڑے افسانہ نگار ہیں ان میں کرشن چندر سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور قرۃ العین حیدر کے ساتھ عصمت چغتائی کا نام لیا جاتا ہے۔ عصمت ایک منفرد اسلوب اور موضوعات کے ساتھ اردو افسانے کی دنیا میں آئیں۔ عصمت وہ واحد خاتون افسانہ نگار ہیں جنھوں نے عورتوں کے مسائل عورتوں کے نقطہ نظر سے پیش کئے۔ انھوں نے بھرے پرے مشترکہ خاندان، تقسیم ہند کے بعد ابھرنے والی شہری زندگی، عورت کا مرد کی ملکیت تصور کیا جانا، ناجائز بچوں کی پیدائش، جنسی دباؤ اور گھٹن اور اس کی غیر فطری نکاسی، ملازت پیشہ عورت کی سماجی حیثیت کے علاوہ عورتوں کے بعض بظاہر چھوٹے لیکن اہم مسائل کو موضوع بنایا۔ عصمت کی افسانہ نگاری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ابتدائی دور میں انہوں نے گھریلو الجھنوں کو موضوع بنایا۔ جوان لڑکیوں کی جنسی گھٹن اور کثیر العیال عورتوں کے المیے پر لکھا۔ ایک مخصوص معاشرے کی عکاسی کی، دبی کچلی عورتوں کے جذبات کی ترجمانی کی۔ جنسی گھٹن کا وہ احساس جو عورتوں کو دبے لہجے میں اظہار کرنے پر مجبور کرتا ہے

اس کی تصویر کشی کی۔ عصمت کی دنیا چاردیواری تک محدود رہی۔

دوسرے دور میں انہوں نے کمیونزم سے متاثر ہوکر افسانے لکھے جن میں ''جڑیں''، ''نوالا''، ''مٹھی مالش'' اور ''لال چونٹے'' جیسے افسانے اہم ہیں۔

تیسرے دور میں ان کی کہانیوں کا موضوع بمبئی کی صنعتی زندگی اور فلمی ماحول ہے۔

عصمت نے جس زمانے میں افسانہ نگاری شروع کی اس زمانے میں شریف لڑکیوں کا افسانہ لکھنا تو کجا افسانہ پڑھنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا عصمت کے لکھنے کی ابتدا ''فسادی'' سے ہوتی ہے۔ یہ ان کی پہلی تحریر ہے جو ساقی ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ عصمت کی ابتدائی تحریروں پر ڈرامے کا بے حد اثر ہے۔ وہ ڈرامائی انداز میں چھوٹے چھوٹے مکالموں کے ذریعہ کہانی کے تانے بانے بُنتی ہیں۔ عصمت نے اپنے افسانوں میں وہی ماحول پیش کیا جو ان کا اپنا ماحول تھا۔ متوسط طبقے کے مسلم گھرانوں کی تصویر کھینچی۔ یہ بھرا پُرا گھر ہے جہاں بچوں کی کثیر تعداد موجود ہے مشترکہ خاندان میں ممیرے، چچیرے، خلیرے بہن بھائی ہیں۔ ان کی چاہتیں ہیں۔ رسوائیاں، لگاوٹیں، حلاوتیں ہیں۔ معاشی بدحالی، کنواری لڑکیاں۔ ان کی شادی کی فکر۔ بے ضرر گالیاں، جائز و ناجائز بچوں کی کثرت پائی جاتی ہے۔ گھر پر بزرگ عورتوں کی حکومت ہے یہ بزرگ عورتیں دادیاں، نانیاں یا خالائیں و پھوپھیاں ہوتی ہیں۔ گھر کے مردوں کے سوائے بچے پیدا کرنے کے کسی اور معاملے میں دلچسپی نہیں ہے۔

عصمت وہ واحد خاتون افسانہ نگار ہیں جنھوں نے متوسط گھرانے کی عورتوں کے مسائل، دکھ تکلیف، مسرت خوشیاں ان سب کو ایک عورت کی نظر سے دیکھا۔ ہندوستانی عورت کی گھٹن ہی نہیں اس کی بیداری کو پیش کی۔ ایک ایسے دور میں جب کہ جنس عورت کے لئے شجر ممنوعہ بنی ہوئی تھی اور مذہبیت و شرافت کی آڑ میں کی جانے والی مکاریوں اور فریب کی پردہ پوشی کی جاتی تھی عصمت جراءت مندانہ انداز میں اسے بے نقاب کیا وہ اصلاح نہیں کرتیں۔ اصلاحِ معاشرہ ان کا منصب نہیں ہے لیکن وہ تصویر کا وہ رخ دکھاتی

ہیں کہ ان مسائل کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقتوں سے نفرت ہوتی ہے۔

عصمت نے اپنے افسانوں کا مواد اپنے گھر سے لیا ان کے ابتدائی افسانوں میں طے شدہ شادیوں کے خلاف احتجاج ملتا ہے۔ انہوں نے ایک مسئلہ کو پیش کیا جس میں عورت اور مرد یکساں طور پر ایک فعل کے مرتکب ہوتے ہیں۔ لیکن خمیازہ عورت کو بھگتنا پڑتا ہے۔ مرد صاف بچ جاتا ہے۔ ناجائز بچے کا سارا بوجھ عورت پر آجاتا ہے اور سماج اسے نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ عصمت چاہتی ہیں کہ عصمت و عفت کے تصور میں مرد اور عورت کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جائے۔ اس مسئلہ کو عورت کی طرح سوچنا نسائی حسیت ہے۔

ابتدائی افسانوں فسادی، گیندا، شادی، انتخاب جوانی، سانپ، ڈھیٹ، خدمت گار، تاریکی، بتے، کافر، پنکچر اور بھول بھلیاں میں انھوں نے طے شدہ رشتوں کے خلاف احتجاج کیا اور محبت کی شادی کو ترجیح دی ہے۔ ان میں سے اکثر افسانوں میں لڑکیاں ناجائز بچے کی ماں بن جاتی ہیں۔ عصمت ماں بننے کو عورت کا حق سمجھتی ہیں اکثر لڑکیاں تو اس بات سے بے خبر رہتی ہیں کہ وہ کب اور کیسے ماں بن گئیں۔ ان لڑکیوں کی لاعلمی کے بارے میں فضیل جعفری لکھتے ہیں۔

''عصمت کے افسانوں میں دراصل جنس، عمر، طبقاتی فرق جیسے عمومی Barriers ایسے دروازوں کا کام کرتے ہیں جن سے گذر کر ان کا افسانوی کردار اور خصوصاً نوجوان کردار کبھی خارجی دنیا کے بارے میں اور کبھی خود اپنے متعلق لاعلمی کی سرحد سے گذر کر علم کی حدود میں داخل ہوتا ہے۔ علم و آگہی کے اس ایک لمحے پر پورے افسانے کا دارومدار ہوتا ہے۔[1]

عصمت کا ابتدائی افسانہ نیرا یا گیندا ہے (خود عصمت نے وثوق سے اپنے پہلے افسانے کے بارے میں نہیں بتایا۔ فسادی ڈراما ہے۔) [2]

ان دونوں افسانوں میں نچلے طبقے کی لڑکیاں اونچے طبقے کے لڑکوں کی ہوس کا

---

[1] فیصل جعفری عصمت چغتائی کا فن اردو افسانہ روایت اور مسائل ص۔۴۳

[2] لونس، اگاسکر عصمت چغتائی سے ملاقات شاعر شمارہ ۳ جلد ۴۷ ص ۱۴

نشانہ بن کر ماں بن جاتی ہیں۔ گیندا میں عصمت نے بچپن کی شادی اور کمسن بیوہ کو بھی موضوع بنایا ہے۔ گیندا ایک ایسی لڑکی ہے جس کی شادی بچپن میں کردی گئی اور پھر وہ بیوہ ہوگئی۔ شادی اور بیوہ ہونے پر گیندا کا کوئی اختیار نہیں اور نہ مرضی کا دخل ہے۔ شعوری طور پر وہ شادی کا مطلب ہی نہیں سمجھتی۔ اور جب ایک ناجائز بچے کی ماں بنادی جاتی ہے تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیسے ہوا؟ عصمت نے مردانہ سماج کے جبر کی ایک ایسی تصویر پیش کی جس میں معصوم لڑکیوں کو ناکردہ گناہوں کی سزا دی جاتی ہے۔ کہانی بیان کرنے والی واحد متکلم حاضر بھی لڑکی ہے اس لئے اس افسانے میں ایک لڑکی کا نقطۂ نظر اور نسائی حسیت پائی جاتی ہے۔ افسانے کی ردائی لڑکی کا بھائی جو اس فعل میں برابر کا شریک ہے صاف بچ جاتا ہے اور 'گیندا' کو بدچلن کہا جاتا ہے۔ اس پر یہ بھی الزام ہے کہ اس نے ایک شریف لڑکے کو بہکایا۔ عصمت نے گیندا کے کردار میں ایک ایسی لڑکی کو پیش کیا جو اس معاشرے میں کٹھ پتلی بنی ہوئی ہے۔ جس کے کسی عمل میں اس کی مرضی کا دخل نہیں۔ اس معاشرے کے جبر کا شکار بنی جاتی ہے۔ کہانی کی راوی لڑکی اس عورت سے ہمدردی محسوس کرتی ہے اور ایسے سوالات اٹھاتی ہے کہ عصمت کی نسائی حسیت یہ سوچنے پر مجبور کردیتی ہے کہ اس مردانہ سماج میں عورت کی حیثیت بہت کمزور ہے۔ عورت بے بسی کی تصویر ہے۔

''نیرا'' کا تعلق بھی نچلے طبقے سے ہے۔ وہ ایک گوالن ہے۔ اپنے بیمار باپ کی معذوری کی وجہ سے وہ بازار میں دودھ فروخت کرنے جاتی ہے۔ سیٹھ کا لاڈلا بیٹا چھٹیاں گذارنے کے لئے گاؤں آتا ہے اور نیرا سے جھوٹ موٹ کا بیاہ رچا کر اس کے ساتھ رہنے لگتا ہے۔ بعد میں وہ ایک امیر لڑکی سے شادی کرلیتا ہے اور نیرا کو بے سہارا چھوڑ دیتا ہے۔ نیرا پیشہ کرنے پر مجبور ہوجاتی ہے۔ عصمت نے اس افسانے میں لڑکیوں کی اس ذہنیت کو اجاگر کیا ہے جو شادی کو تحفظ کا ذریعہ سمجھتی ہیں۔ لیکن مرد کے پاس شادی کی کوئی حقیقت نہیں جبکہ عورت 'لفظ' بیاہ کے فریب میں آکر مرد کو سب کچھ سونپ دیتی ہے۔ سماج کی چوری سے کیا ہوا کام انسان کو کتنا بے بس بنادیتا ہے اس کی تصویر نیرا ہے۔ لیکن اس مردانہ سماج میں

عورت کو ہی برا بھلا بھی کہا جاتا ہے اور مرد کے فریب کا شکار ہو کر معاشرے میں ذلیل بھی عورت ہی ہوتی ہے۔ عصمت نے جسم فروشی کے عوامل بھی تلاش کئے ہیں۔ جتنی جسم فروش عورتیں ہیں ان میں سے ایک کثیر تعداد ایسی عورتوں کی ہے جو مردوں کے فریب کا شکار ہوئیں اور ایسے دوراہے پر پہنچ گئیں جہاں سے وہ نہ اپنے ماں باپ اور گاؤں واپس ہو سکتی ہیں۔ اس لئے ان کے لئے صرف جسم فروشی کا ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے۔ اس معاشرے میں تنہا عورت چاہے کسی طرح زندگی گذارنے کی کوشش کرے مرد اسے بے سہارا پا کر جسم فروشی کے راستے پر لا ڈالتا ہے۔ مردانہ سماج میں عورت کو سب سے زیادہ دام جسم کے ملتے ہیں۔ چنانچہ نیرا بھی سوچتی ہے تندرست جسم اور چمکتے ہوئے گالوں کی قدر ہے۔ بھرپور جسم ہی عورت کی دولت ہے چاہے وہ لونڈی ہو چاہے رانی، جب تک بدن چست اور گال چکنے ہیں سب کچھ ہے اور پھر؟ پھر تو کچھ بھی نہیں۔ نیرا کو یقین بھی نہ تھا کہ وہ سوائے گوبر تھوپنے گھاس چھیلنے کے کسی اور مصرف کی بھی ہو سکتی ہے۔ اب یہاں اس کی یہ حالت تھی کہ کیا امیر اور کیا غریب ہر ایک کے لئے اس کے آشرم کے دروازے کھلے ہوئے تھے'' [1]

اس طرح عصمت نے نچلے طبقے کی ایک چوٹ کھائی ہوئی عورت کی تصویر نسائی حسیت کی مدد سے کھینچی ہے۔

''جوانی'' میں جنّو اپنے ہی طبقے کے شبراتی کی ہوس کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ ماں بننے والی ہے لیکن خود ہی بے خبر ہے۔ اس کی ماں اسے پیٹتی ہے اور شبراتی کو کاٹ ڈالنے کی دھمکی دیتی ہے۔ جنّو کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ عصمت جنّو کے ماں بننے کی ذمہ داری اس ماحول پر ڈالتی ہیں جہاں جنّو کی ماں کثیر العیال ہے۔ بچوں کی پرورش کی ذمہ داری جنّو پر ہے۔ بچوں کی ہجوم میں جنّو کی ماں جنّو کے بارے میں کچھ نہیں جانتی کہ وہ اندرونی طور پر کس کشمکش سے گذر رہی ہے۔ عصمت نے بچوں کی کثرت سے بیزاری اور نفرت کا اظہار کیا ہے۔ وہ ایسی عورتوں سے نفرت کرتی ہیں جو بچے ڈھالنے کی مشین بن

---

[1] کلیاں۔ نیرا ص۔ ۲۵۷

جاتی ہیں۔

''تاریکی'' میں کہانی کا مرکزی کردار نچلے طبقے کی ایک لڑکی کو ماں بننے پر مجبور کردیتا ہے۔ لیکن جس بہن کو وہ معصوم اور شریف سمجھتا ہے وہ بیمار ہو جاتی ہے اور ڈاکٹر بتاتا ہے کہ اس کی بہن ماں بننے والی ہے۔ عصمت نے اس مردانہ سماج پر طنز کیا ہے جو دوہرا معیار اپناتا ہے۔ اپنے کچھ اور دوسروں کے لئے کچھ اور — کہانی کا مرکزی کردار یہ توقع ہی نہیں کرسکتا کہ اس کی بہن بھی اس صورت حال سے گذر سکتی ہے۔

''بھول بھلیاں'' میں بھی متوسط طبقے کی رفیعہ ماں بن جاتی ہے۔ رفیعہ کا کزن صلاح الدین اعظم جو عمر میں اس سے چھوٹا ہے پیار کرنے لگتا ہے۔ صلاح الدین سارے گھر کا لاڈلا ہے۔ اسی لاڈ و پیار کے نتیجے میں وہ رفیعہ کے قریب ہو جاتا ہے۔ دونوں کی شادی ہو نہیں پاتی۔ ایک عرصہ بعد صلاح الدین رفیعہ سے ملتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے رفیعہ جس لڑکے کی پرورش کررہی ہے وہ اس کا اپنا بیٹا ہے۔ عصمت نکاح اور شادی کی قائل نہیں معلوم ہوتیں۔ ان افسانوں میں گیندا اور جتو ناسمجھی میں ماں بن جاتی ہیں۔ 'نیرا' شادی کا ڈھونگ ختم ہونے کے بعد پیشہ کرنے لگتی ہے لیکن رفیعہ جو مسلم متوسط طبقے کی لڑکی ہے کیوں جان بوجھ کر ماں بنتی ہے۔ اور صلاح الدین کے بچے کی پرورش کرتی ہے یہ ایک سوال ہے جس کا جواب یہی دکھائی دیتا ہے کہ عصمت معاشرے میں باپ کو کوئی اہمیت دینا نہیں چاہتیں وہ بچے کی شناخت ماں کے ذریعہ اور معاشرے کو مادرانہ معاشرہ بنانا چاہتی ہیں۔

'فسادی' میں بھی نشاط اپنے بھائی سے منسوب اور عمر میں بڑی لڑکی عزت سے پیار کرنے لگتا ہے اور اپنے اس پیار کا بانگ دہل اعلان کرتا ہے۔

''انتخاب'' شمیم اور واجد اپنی خالہ بی کے گھر پڑھائی کی غرض سے رہتے ہیں۔ عالم واجد کا دوست ہے اور شمیم سے بے تکلف ہے۔ خالی بی کو عالم کا گھر آنا پسند نہیں ہے۔ لیکن عالم کی بعض باتوں سے وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتی ہیں کہ عالم ان میں دلچسپی لے رہا ہے۔ وہ عالم سے اظہارِ عشق کرتی ہیں۔

''سانپ'' میں رفیعہ بچپن میں طے شدہ رشتے کے خلاف اپنی پسند سے شادی کرتی ہے۔اس کا منگیتر غفار ایک سیدھا سادھا روایت پرست نوجوان ہے۔ رفیعہ اور سید دونوں بھائی بہن ہیں۔ ان کے والد کا انتقال ہو جاتا ہے جو لوگ ان کے گھر پرسہ دینے آتے ہیں دونوں ان سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ سید اور خالدہ روایتی عشق کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ظفر بھی رسموں اور روایتوں سے سخت متنفر ہے وہ عورت کو صنف نازک نہیں سمجھتا۔ رفیعہ اپنی پسند سے ظفر سے شادی کرتی ہے۔اس افسانے میں عصمت نے مروجہ اقدار سے بغاوت کی ہے۔

''ڈھیٹ'' مکالموں پر مبنی افسانہ ہے۔ افسانے کی واحد متکلم حاضر عورت کے مروجہ تصور کے خلاف احتجاج کرتی ہے۔ عورت کو کمزور سمجھنا، شادی کو روحانی رشتہ سمجھنا، عورت کے اپنی شادی کے بارے میں گفتگو کرنے کو بے شرمی تصور کرنا دوزخ اور جنت کا روایتی تصور، مرد کو دیوتا یا مجازی خدا سمجھنا ان ساری باتوں کا مذاق اڑاتی ہے۔ وہ اصرار کرتی ہے کہ عورت اور مرد کو برابر سمجھا جائے۔

''بنّے'' میں اللہ بی پینتیس برس کی کنواری خاتون ہیں۔ اپنی بھانجی زہرہ اور بھانجے کی پرورش کر رہی ہیں وہ زہرہ کی شادی چالیس برس کے ڈپٹی صاحب سے طے کرتی ہیں جن کی ایک بیوی اور دو بچے پہلے ہی سے موجود ہیں۔ بنّے اور زہرہ ایک دوسرے سے بے تکلف ہے۔ اسی بے تکلفی میں انہیں احساس ہوتا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ اللہ بی دونوں کے بیچ دیوار نہیں بنتیں۔

''پنکچر'' کی واحد متکلم حاضر ایک لڑکے سے پیار کرتی ہے۔ دونوں کبھی اظہار محبت نہیں کرتے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ اس لڑکے کو جلانے کے لئے وہ منظور پر مہربان ہو جاتی ہے۔ اس سے شادی کرنا چاہتی ہے لیکن جب وہ لڑکا اپنے عشق کا اظہار کرتا ہے تو وہ منظور سے شادی کا ارادہ ترک کر دیتی ہے۔

عصمت کے ابتدائی افسانوں میں روایت سے بغاوت کا احساس ملتا ہے۔ وہ

محبت اور شادی، کے مروجہ تصور سے انحراف کرتی ہیں۔ محبت اور شادی کے لئے وہ عمر و طبقاتی فرق کی قائل نہیں ہیں۔ عشق میں ان کے کردار آہیں نہیں بھرتے۔ ایک دوسرے کے فراق میں آنسو نہیں بہاتے۔ جس گھرانے کی عصمت تصویر پیش کرتی ہیں وہاں رشتہ کے بھائی بہنوں میں بے تکلفی ہے۔ یہ لڑکے لڑکیاں تعلیم یافتہ ہیں۔ لڑکے لاڈ و پیار میں بگڑے ہوئے ہیں۔ لڑکیوں سے گریبان کے بٹن ٹانکنے کی فرمائش کرتے ہیں۔ ہیروین کی بے رخی پر بیمار ہو جاتے ہیں اور اپنی ضد پوری کرتے ہیں۔ ان افسانوں میں یکسانیت ہے۔ تنوع نہیں ہے۔ عصمت نے مرد کا نقطہ نظر بھی پیش کیا روشن خیال مرد بھی عورت کے بارے میں سوچتے ہیں کہ اسے تعلیم حاصل کرنے کی بجائے امور خانہ داری میں مہارت حاصل کرنا چاہیے۔ مثلاً ''انتخاب'' کا عالم، شمیم سے کہتا ہے ''وہ ہارڈی ہوں یا پھارڈی تمہارے بس کا روگ نہیں کیوں دماغ کھپاتی ہو اس سے بہتر ہے کہ جا کر روٹی پکانا سیکھو جو کسی کام بھی آئے۔''

لیکن ان کے افسانوں کے بعض مرد عورت کو مرد کے برابر سمجھتے ہیں۔ جیسے ''سانپ'' کا ظفر کہتا ہے۔

غفار: تو تمہارے خیال میں عورتیں صنف نازک کہلانے کی مستحق نہیں۔

ظفر: مستحق! مستحق ہونے کی خوب رہی۔ اجی یہ دنیا کے سارے آرام اور چین اٹھانے کی مستحق ہیں۔ کولھو کے بیل کی طرح جٹ کر ہم کام کریں سر پھٹوائیں دنیا بھر کی آفتیں اٹھائیں ہم اور یہ صنف نازک بن کر ہمارے اوپر بھوت کی طرح سوار ہو جائیں اور پھر صنف نازک اپنی سی کرنے پر اتر آئیں تو وہ گت بنائیں کہ جینا دشوار ہو دیں۔''[1]

افسانہ ''ڈھیٹ'' میں ایک عورت مروجہ تصور کی سختی سے مخالفت کرتی ہے اور ثابت کرتی ہے کہ مرد اور عورت دونوں برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عصمت نے عورت کو جتنی قریب سے دیکھا اور جتنے رنگوں میں پیش کیا کسی اور افسانے نگار نے شاید ہی پیش کیا ہو۔

---

[1] سانپ — کلیاں — ص۔۱۴۴

''جنازے'' میں انہوں نے عورتوں کی اس کمزوری کو پیش کیا کہ عورت خود بغاوت کرنے تیار نہیں اس کے ذہن پر برسوں کی زنگ جمی ہوئی ہے اسے اپنے آپ کو مجبور اور بے بس ظاہر کرنے کا شوق ہے خراب حالات کے لئے وہ دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرا کر اپنے آپ کو بے قصور سمجھتی ہے۔ ریحانہ ایک باغی ذہن کی لڑکی ہے جو یہ سوچتی ہے کہ عورت اس لئے پیدا نہیں ہوئی کہ اس پر ترس کھایا جائے دکھ سہنے دولت اور شہرت کی بھینٹ چڑھانے کے لئے پیدا نہیں کی گئی۔ وہ سوچتی ہے کہ عورت کو ظالم مردوں کی حکومت نہیں برداشت کرنا چاہیے جو اسے غلام سمجھ کر چار دیواری میں قید کر رکھتے ہیں چنانچہ وہ کشور کی مدد کرنا چاہتی ہے۔ جس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف شوکت سے ہورہی ہے وہ کشور جیسی معصوم چڑیا کو شوکت جیسے شکرے کے خوفناک پنجوں سے نکال لے گی۔ وہ سوچتی ہے۔ ''میں نہ صرف کشور ہی کو بچاؤں گی بلکہ میرا ہاتھ اور دور پہنچ کر ہزاروں بیکس لڑکیوں کو پناہ کے احاطے میں لے لے گا۔ راحت کی طرح ساری لڑکیاں قوم کی داسی بن جائیں گی اور پھر پھر ہندوستان آزاد ہو جائے گا''۔

لیکن جب وہ بڑے جوش خروش میں کشور کے ہاں پہنچتی ہے تو معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے کشور خود شوکت سے شادی کرنے تیار ہے۔ وہ بے بسی مجبوری سب محض ڈھونگ تھا۔ عصمت کی نسائی حسیت عورتوں کی کمزوری اور اپنی ذات کے غلط استعمال اور ریا کاری کو بھی بے نقاب کرتی ہے۔ ایک طرف تو کشور جیسی لڑکیاں ہیں جو محبت غریب سے کرتی ہیں اور شادی کسی امیر لڑکے سے۔ دوسری طرف 'چھوٹی آپا' پتہ نہیں کتنے لڑکوں سے پیار کا ڈھونگ کرتی ہیں اور شادی کسی اور سے کرتی ہیں اور شوہر کے سامنے ایسی کم سخن اور شرمیلی بنتی ہیں جیسے کبھی وہ غیر مرد کے آگے آئی ہی نہ ہو۔ عصمت لکھتی ہیں ''ایک ذرا سی محبت کی دنیا میں کتنے شوکت، کتنے محمود عباس، عسکری، یونس اور نہ جانے کون کون تاش کی گڈی کی طرح پھینٹ کر بکھیر دیے گئے ہیں کوئی بتاؤ ان میں سے چور پتہ کون سا ہے''؟ شوکت کی بھوکی بھوکی کہانیوں سے لبریز آنکھیں محمود کے سانپوں کی طرح رینگتے ہوئے اعضاء

عسکری کے بے رحم ہاتھ، یونس کے نچلے ہونٹ کا سیاہ تل۔ عباس کی کھوئی ہوئی مسکراہٹ —اور ہزاروں چوڑے چکلے سینے کشادہ پیشانیاں۔ گھنے گھنے بال، سڈول پنڈلیاں، مضبوط بازو سب کچے سوت کے ڈوروں کی طرح الجھ کر رہ گئے ہیں۔ پریشان ہو کر اس ڈھیر کو دیکھتی ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سا سرا پکڑ کر کھینچوں کہ کھینچتا ہی چلا جائے اور میں اس کے سہارے دور افق سے بھی اوپر ایک پتنگ کی طرح تن جاؤں۔[1]

چھوٹی آپا متوسط طبقے کی پردہ نشین لڑکی ہے لیکن عصمت دکھاتی ہیں کہ بظاہر معصوم نظر آنے والی ان "شریف" لڑکیوں کے اندر کتنے آتش فشاں چھپے ہوئے ہیں۔ پھر یہ لڑکیاں دوہری زندگی گزارتی ہیں۔ چھوٹی آپا اندر سے کچھ ہیں اور بظاہر اپنے شوہر کے سامنے سر پر پلو ڈالے معصوم سی مشکل بنائے بیٹھی ہیں۔

"بیمار" میں بھی انہوں نے عورت کے جذبات کی مختلف روپ دکھائے ہیں۔ ایک تو بیمار ہونے پر بیوی تیمارداری کرتے کرتے اکتا جاتی ہے اور شوہر کی موت کا انتظار کرنی لگتی ہے۔ ڈاکٹر بیمار سے زیادہ اس کی بیوی میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ دوسری عورتیں اس بیمار کو بے ضرر سمجھنے لگتی ہیں مہترانی کی جوان بہو اس سے خوف نہیں کھاتی۔ منجھو بی اب اس سے نہیں شرماتیں۔ وہ بیوی جس نے ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کی قسمیں کھائی تھیں اب جراثیم کے ڈر سے فنائیل سے ہاتھ دھوتی اور سوڈے سے غرارہ کرتی ہے۔

عصمت میاں بیوی کے رشتے میں سب سے زیادہ اہمیت جنس کو دیتی ہیں۔ اس کے بغیر یہ رشتہ کتنا بودا اور کمزور ہو جاتا ہے اس کی انہوں نے عکاسی کی۔ ان افسانوں میں عصمت نے عورت کے دوغلے پن کو اجاگر کیا۔

"نفرت" میں میاں بیوی کا رشتہ نفرت کے بندھن سے بندھا ہے اور مرد اسے چاہتے ہوئے بھی توڑ نہیں سکتا۔ کہانی کا مرکزی کردار متو کو امی کی لڑکی سے شدید نفرت ہے۔ اس کی پیدائش کے موقع پر ہی اس میں نفرت جاگتی ہے۔ یہ لڑکی فخر النساء ہے اور اس

---

[1] جنازے کلیاں ص۔۸۱

گھر میں اس کی بہت اہمیت ہے منّو کی ماں نے اسے بہو بنانے کا ارادہ کرلیا ہے اور وہی اس کی طرفداری کرتے لاڈو پیار اور ضد سہنے کی وجہ سے فخر النساء میں بلا کی خود اعتمادی آگئی ہے اور اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرسکتا۔ وہ اپنے گھر کی تین عورتوں ماں، مامی اور فخر النساء کے تکون میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ وہ اپنی بات نہیں منوا سکتا نہ کوئی اس کی سنتا ہے۔ اس کے خلاف اس کی شادی فخر النساء سے کردی جاتی ہے وہ منّو پر حکمرانی چلاتی ہے بچپن سے جوانی تک اور شادی کے بعد نانی اور دادی بننے تک اس کی حکومت چلتی ہے۔ ذرا سی بات پر اس کے منہ سے گالیوں کا فوارہ ابل پڑتا ہے۔ وہ موٹی اور بھدّی ہے لیکن اس میں احساس کمتری نہیں ہے۔ مرنے کے بعد جنت میں بھی فخر النساء منّو کا پیچھا نہیں چھوڑتی عصمت یہ دکھانا چاہتی ہیں کہ اگر لڑکیوں کی پرورش اور پرورداخت فطری انداز میں ہو تو ان میں خود اعتمادی آجاتی ہے اور اپنے شوہر کے مقابلے میں اسے برتر موقف حاصل ہوتا ہے۔

''پردے کے پیچھے'' میں انہوں نے متوسط طبقے کی ان لڑکیوں کو موضوع بنایا جو گھٹے گھٹے ماحول میں سانس لے رہی ہیں۔ ان کے ذہنوں میں تخیلی شہزادے بسے ہوئے ہیں۔ یہ لڑکیاں چار دیواری میں بند نہیں ہیں بلکہ تعلیم حاصل کر رہی ہیں انہیں تعلیم سے زیادہ اس بات کی فکر ہے کہ لڑکے ان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ انھوں نے ایک ایک لڑکے کو خود سے منسوب کرلیا ہے۔ انھیں یہ جاننے کی خواہش ہے کہ چلمن کے باہر سے وہ لڑکوں کو نظر بھی آتی ہیں یا نہیں اور اگر نظر آتی ہیں تو کیسی؟ کہانی کی 'میں' چلمن کی دوسری طرف جا کر بتاتی ہے کہ وہ لڑکیاں وہاں سے کیسی نظر آتی ہیں۔ کون سی لڑکی کس جگہ بیٹھے تاکہ صاف نظر آئے۔ وہ سب لڑکیاں اس کے کہنے پر بے چوں وچراں عمل کرتی ہیں۔ عصمت نے عورت کے اندر دبی ہوئی نمائش کرنے کی خواہش کو نمایاں کیا ہے۔ دراصل عورت خود اس بات کی متمنی ہوتی ہے کہ مرد اسے دیکھے اس کے حسن کی تعریف کرے اسے چاہے۔ یہی خواہش عجیب عجیب رنگ دکھاتی ہے۔

عصمت نے عورت کو جتنا قریب سے دیکھا اور پیش کیا یہ رنگارنگی اردو ادب میں

بالکل نئی چیز تھی۔ انہیں متوسط طبقے کے رشتوں کی نزاکت کا احساس ہے اور وہ اسے کسی فوٹو گرافر کی طرح من وعن پیش کرتی ہیں۔ متوسط گھرانوں میں 'ساس' بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ عصمت نے اس ایک رشتہ رکھنے والی عورت کے دو رنگ پیش کئے۔ ایک ''ڈائن'' ہے دوسری ''ساس'' — ! ''ڈائن'' میں ایک ایسی عورت ہے جسے اپنی بیٹی کے آرام کا خیال ہے وہ اپنی بیٹی کو ناسمجھ اور بچی سمجھتی ہے۔ بیٹی اور داماد کو خوش رکھنے کے لئے گھر کی ساری ذمہ داریاں اپنے سر لیتی ہے ہر معاملہ میں وہ خود مشورہ دیتی ہے۔ گریبان کے بٹن ٹانکنے سے لے کر باورچی خانے تک — بیٹی کے کپڑوں کے انتخاب سے لے کر چوٹ کھائے ہوئے داماد کی مرہم پٹی تک — گھر کے سودا سلف سے لے کر بچوں کی تربیت تک — ہر معاملے میں اس ساس کا دخل ہے عصمت نے ایسے بے شمار چھوٹے چھوٹے واقعات پیش کئے جس میں شوہر یہ چاہتا ہے کہ اس کے کام اس کی بیوی انجام دے۔ اس کی اپنے ذہن سے سوچ اپنے فیصلے خود کرے۔ لیکن یہ بات اس کی بیوی سمجھ نہیں پاتی۔ ساس کی یہ محبت ان کی آزادی چھین لیتی ہے۔ ایک عذاب بن جاتی ہے۔ وہ اپنی بیوی کو سمجھا نہیں پاتا تو جھلا کر گھر سے چلا جاتا ہے اور اس کی ساس سمجھتی ہے کوئی ڈائن ان کا گھر لگاڑ رہی ہے۔ عصمت نے متوسط طبقے کے گھرانے کی عمدہ تصویر کھینچی ہے جہاں بزرگ بے جا لاڈ و پیار سے اپنی لڑکیوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ ان کی زندگی پر مسلط رہتے ہیں انہیں آزادی سے جینے نہیں دیتے۔ بے جا لاڈ و پیار لڑکیوں کو آرام پسند اور کند ذہن بنا دیتا ہے۔

'ساس' میں بظاہر ساس تنک مزاج ہے اپنی بہو کو ڈانٹتی اور گالیاں دیتی ہے لیکن اس بہو کو ذرا سی چوٹ آتی ہے تو تڑپ اٹھتی ہے اور اپنے ہاتھوں سے مرہم پٹی کرتی ہے۔ وہ بہو اور بیٹے کی زندگی پر مسلط نہیں ہے۔ بظاہر سخت لیکن باطن میں محبت کرنے والی عورت اس کی گالیاں ایسی ہیں کہ اس کی بہو بے مزہ نہیں ہوئی۔

''روشن'' کا موضوع ایک ایسا مسئلہ ہے جو مسلم متوسط گھرانوں کا سب سے اہم مسئلہ ہے یعنی لڑکیوں کے لئے مناسب بر کی تلاش۔ اس بَر کی تلاش میں کیا کیا پاپڑ بیلنے

پڑتے ہیں اور کیسی کیسی حرکتیں کرنی پڑتی ہیں جب کہ یہ تصور کرلیا گیا تھا کہ شریف اور خاندانی لڑکے ہندوستان سے ہجرت کر گئے ہیں۔ خاص طور پر یہ مسئلہ سید گھرانوں میں سنگین صورت اختیار کر گیا تھا۔ لڑکوں کی تلاش میں معمولی بات نہ تھی۔ پھر ایسا لڑکا جس کی ہڈی میں کھوٹ نہ ہو اس کا ملنا بے حد دشوار تھا۔ اگر ایسا لڑکا مل جاتا تو اسے راغب کرنے کتنے جتن کرنے پڑتے تھے اس کی عصمت نے خوبصورتی سی عکاسی کی ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار اصغری خانم ہیں جو لڑکیوں کے رشتے طے کرنے میں ماہر سمجھی جاتی ہیں۔ انہوں نے کئی ایسی لڑکیوں کی شادیاں کروائی ہیں جن کی شادی بظاہر ممکن نہ تھی۔ صبیحہ ان کی ممیری بہن کی لڑکی ہے صبیحہ کا بھائی صمد چھ برس انگلستان میں رہ کر لوٹا ہے اس کی آمد کی خوشی میں میلاد شریف کروایا جاتا ہے اس میلاد شریف میں صمد کا دوست روشن بھی شرکت کرتا ہے روشن ڈاکٹر ہے اور لندن میں ملازم ہے۔ اس کے ماں باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ تنہا زندگی گذار رہا ہے۔ اصغری خانم روشن کو صبیحہ کے لئے منتخب کرلیتی ہیں اور طرح طرح کی ترکیبوں سے روشن اور صبیحہ کو ملنے کے کے مواقع فراہم کرتی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں۔ اصغری خانم صمد سے کہتی ہیں کہ روشن سے کہے کہ وہ اپنے بہنوئی کے ذریعہ صبیحہ کے لئے رشتہ کا پیغام بھیجے۔ صمد حیران رہ جاتا ہے لیکن اصغری خانم اس کی ایک نہیں سنتی صمد یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا ہے کہ اس کے بزرگ روشن خیال ہو گئے ہیں۔ صمد سائنس کانفرنس میں شرکت کے لئے جاتا ہے۔ شادی کی تیاریاں زور وشور سے کی جاتی ہیں۔ لیکن صمد جب کانفرنس سے لوٹتا ہے تو گھر میں سناٹا سا نظر آتا ہے۔ وہ سسکیاں بھرتی ہوئی صبیحہ سے قسم دلا کر پوچھتا ہے کہ کیا ہوا تو وہ ایک مڑا تڑا سا کارڈ اس کے سامنے رکھ دیتی ہے۔ جس پر لکھا ہے 'روشن لال کچلو'——!

عصمت ان کمزوریوں کو دکھایا ہے کہ بڑی بوڑھیاں بلا سوچے سمجھے لڑکوں کو پھانسنے لگتی ہیں وہ لڑکوں کے بارے میں زیادہ تفصیلات جاننے کی کوشش نہیں کرتیں اپنی عیاری سے ایسے حالات پیدا کرتی ہیں کہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کے قریب آجائیں۔

عصمت کے ہاں محبت قربت کا نتیجہ ہوتی ہے ان کے ہیرو یا ہیروین پہلی نظر کے تیر سے گھائل نہیں ہوتے۔ اسی لڑکے میں اچانک ساری خرابیاں نظر آنے لگتی ہیں جب یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ لڑکا دوسرے مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ اور پھر سارا قصور لڑکی کے سر رکھ دیا جاتا ہے۔ عصمت مسلم متوسط طبقے کی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف ہیں وہ اس معاشرے کے دوہرے پن کو واضح کرتی ہیں۔ خاص طور پر سیّدوں کے گھرانے میں جس طرح پردہ کیا جاتا ہے اس پر عصمت گہرا طنز کرتی ہیں۔

''ان دنوں سیّدوں میں بھی کانا پردہ شروع ہوگیا ہے خاندان کے بڑے بوڑھوں کی آنکھ بچا کر لڑکیاں کھلے منہ نمائش میں جائیں، مشاعروں میں شریک ہوں، سہیلیوں کے بھائیوں اور بھائیوں کے دوستوں سے بڑی بوڑھیوں کی رضا مندی لے کر مگر سڑک پر جاتے وقت تانگے میں پردہ باندھا جاتا ہے بزرگوں کو دکھانے کے لئے۔''

اسی موضوع پر عصمت نے ''چوتھی کا جوڑا'' لکھا جو ادب عالیہ میں اونچا مقام رکھتا ہے۔ یہ کہانیاں اس دور سے تعلق رکھتی ہیں جب مسلمان معاشی بدحالی کا شکار تھے ان کی جاگیریں چھین لی گئی تھیں۔ مسلم گھرانوں میں بھی ذات پات کی لعنت تھی۔ کھاتے پیتے ملازم لڑکوں کا کال تھا۔ لڑکوں کو ملازمت ملنا قریب قریب ناممکن تھا۔ اکثر لڑکے مستقبل سے مایوس ہو کر پاکستان چلے گئے تھے لڑکیاں غیر تعلیم یافتہ تھیں لڑکیوں کا ملازمت کرنا سخت معیوب سمجھا جاتا تھا لڑکیاں گھٹے گھٹے ماحول میں پرورش پاتی تھیں ان کا زور سے بولنا، قہقہہ لگانا، زمین پر زور سے پاؤں رکھنا، بڑی بوڑھیوں کے درمیان بیٹھنا، ان کی باتوں کو سننا۔ معیوب سمجھا جاتا تھا۔ کہانی میں سب سے اہم مسئلہ کبریٰ کی شادی ہے۔ جو بہت ہی کم گو اور معمولی شکل وصورت کی لڑکی ہے عصمت اس کے بارے میں لکھتی ہیں نہ اس کی آنکھوں میں کرنیں ناچیں نہ اس کے رخساروں پر زلفیں پریشان ہوئیں نہ اس کے سینے میں طوفان اٹھے تھکی تھکی سہمی سہمی جوانی کب دبے پاؤں اس پر رینگ آئی ویسے ہی چپ چاپ نہ جانے کدھر چلی گئی میٹھا برس نمکین ہوا پھر کڑوا ہوگیا۔

کبریٰ یتیم ہے۔ کبریٰ کی ماں بی اماں شوہر کے مرنے کے بعد کپڑے سی سی کر گذارا کر رہی ہیں کم سے کم کپڑے میں مطلوبہ لباس تیار کرنے میں انھیں مہارت حاصل ہے۔ ادھر کبریٰ کی جوانی آخری سانسیں لے رہی ہے اور حمیدہ پر جوانی آرہی ہے بی اماں کو کبریٰ کی شادی کی بہت فکر ہے۔ ایسے میں بی اماں کے منجلے بھائی کا بڑا لڑکا راحت پولیس کی ٹریننگ کے سلسلے میں آتا ہے بی اماں اسے اپنے گھر میں رکھتی ہیں۔ اپنی بہن کو مدد کے لئے اپنے گھر بلوا لیتی ہیں۔ دونوں بوڑھیاں یہ فیصلہ کرلیتی ہیں کہ کسی طرح کبریٰ کی شادی راحت سے کردی جائے۔ بی اماں بچا کچھا زیور فروخت کر کے کمرے کو جھاڑ پونچھ کر درست کرتی ہیں کبریٰ رات بھر مسالے پیستی ہے تاکہ راحت کو مزے دار کھانے کھلا سکے حمیدہ یہ دعا کرتی ہے کہ میری آپا کا نصیبہ کھل جائے تو سو رکعت نفل پڑھے گی۔ یہ لوگ روکھا سوکھا کھا کر راحت کی خاطر کرتے ہیں تلے ہوئے پراٹھے کوفتے بھونا ہوا گوشت پکتا ہے۔ کبریٰ دن بھر چولہے میں جھلستی رہتی ہے راحت کا کمرہ صاف کرتی ہے اس کے بدبودار موزے دھوتی ہے رومال، تکیے غلاف صاف کرتی ہے۔ اس کے باوجود راحت کبریٰ کی جانب راغب نہیں ہوتا۔ دونوں بوڑھیاں یہ طے کرتی ہیں کہ حمیدہ راحت سے ہنسی مذاق کیا کرے۔ کبریٰ بھی منت سماجت کرتی ہے۔ حمیدہ محسوس کرلیتی ہے کہ راحت ٹھیک آدمی نہیں ہے لیکن اس کی کوئی نہیں سنتا۔ آخر ایک روز جب کہ گھر میں میلاد ہوتی ہے وہ مولوی صاحب کا دم کیا ہوا ملیدہ راحت کو کھلانے لے جاتی ہے اور راحت کی ہوس کا شکار ہو جاتی ہے دوسری صبح راحت واپس ہو جاتا ہے کیوں کہ اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی ہے۔ بی اماں کے گھر میں موت کا سناٹا چھا جاتا ہے۔ کبریٰ دق کا شکار ہو کر مر جاتی ہے اور بی اماں جنھیں کبریٰ کا چوتھی کا جوڑا تیار کرنا تھا اس کا کفن تیار کرتی ہیں۔

عصمت نے متوسط مسلم طبقے میں لڑکیوں کی شادی کے مسئلے کے جتنے زاویے ہو سکتے تھے دکھائے ہیں ان میں ''چوتھی کا جوڑا'' سب سے موثر افسانہ ہے۔ اس افسانے میں راحت اور کبریٰ کے والد کے علاوہ سارے کردار نسوانی ہیں۔ اس افسانے کا سب سے

نمایاں وصف وہ زیریں لہر ہے جو اس طبقے کے درد کو محسوس کرواتی ہے۔ بی اماں ایک معصوم عورت ہیں۔ وہ کپڑے سی کر اپنی دونوں لڑکیوں کا پیٹ پال رہی ہیں ان کا جہیز تیار کر رہی ہیں۔ بی اماں کے طبقے اور ماحول نے انہیں جو کچھ سکھایا اور انہوں نے خود جو کچھ تجربہ حاصل کیا اس کی روشنی میں وہ کبریٰ کی شادی کی تدبیر کرتی ہیں۔ اپنا زیور بیچ کر وہ لڑکی کی شادی کا جتن کرتی ہیں۔ لیکن ساری تدبیریں الٹی ہو جاتی ہیں۔

کبریٰ ایک سیدھی سادھی معمول شکل وصورت کی لڑکی ہے۔ جس کو اس کے طبقے نے یہ سکھایا ہے کہ لڑکی کی پیدائش کا مقصد یہی ہے کہ وہ اپنے خاوند کی خوب خدمت کرے۔ وہ راحت کا دل محنت سے جیتنا چاہتی ہے۔ اپنی ماں اور خالہ کے کہنے پر وہ راحت کو اپنا شوہر تصور کر لیتی ہے۔ وہ صبح سویرے اٹھ کر مشین کی طرح جٹ جاتی۔ نہار منہ پانی کا گھونٹ پی کر راحت کے لئے پراٹھے تلتی ہے دودھ ابالتی ہے تاکہ موٹی سی بالائی پڑے۔ اس کا بس نہیں چلتا کہ اپنی چربی نکال کر ان پراٹھوں میں تل دے۔ اس نے کبھی راحت کو نہیں دیکھا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی بات ہے کہ کسی طرح راحت اسے اپنا لے وہ اپنی ماں اور خالہ کے اشاروں پر ناچتی ہے۔ کبریٰ ایک سدھائے ہوئے جانور کی طرح مشقت کرتی ہے۔ لیکن اسے اس کا پھل نہیں ملتا۔ راحت اس کے جذبات اور احساسات سے بے خبر گھر چلا جاتا ہے جہاں اس کی شادی طے ہے۔ راحت کے جانے کے بعد کبریٰ دق کا شکار ہو کر مر جاتی ہے۔ کبریٰ متوسط گھرانوں کی ان بیاہی لڑکیوں کی علامت بن جاتی ہے۔ اور یہ ایسی علامت ہے۔ کہ جب تک یہ مسئلہ زندہ ہے یہ علامت بھی زندہ رہے گی۔ حمیدہ جوان ہے خوبصورت ہے۔ نئے دور کی لڑکی ہے۔ وہ کھل کر احتجاج تو نہیں کرتی لیکن سارے ماحول اور مروجہ رسموں کے خلاف اس کے ذہن میں باغیانہ خیالات ہیں۔ راحت کی جس طرح آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ کبریٰ جس طرح باورچی خانے میں اپنا خون جلاتی ہے۔ اماں اپنے زیور فروخت کرتی ہیں ان ساری باتوں کے خلاف اس کا جی کڑھتا ہے۔ شادی کی رسم کے خلاف باغیانہ سوالات جنم لیتے ہیں لیکن پھر بھی وہ اپنے گھر والوں کے

کہنے پر عمل کرتی ہے حمیدہ نئے دور کی لڑکی کا پیش خیمہ ہے۔ وہ احتجاج کرتی ہے لیکن لڑ نہیں سکتی اور راحت کی ہوس کا شکار بن جاتی ہے۔

عصمت کی نسائی حسیت نے اس افسانے کو انفرادیت عطا کی اور اونچا مقام بخشا۔ عورتوں کی توہم پرستی۔ جیسے کپڑا بیوتنے کے وقت اگر کلی الٹی کٹ جائے تو یہ سمجھنا کہ نائن کی لگائی ہوئی بات میں ضرور کوئی اڑنگا لگے یا تو دور کی کوئی داشتہ نکل آئے گی یا اس کی ماں ٹھوس کڑوں اڑنگا باندھے گی جو گوٹ میں کام آجائے تو سمجھنا کہ بیر پر بات ٹوٹے گی یا بھرت کے پایوں کے پلنگ پر جھگڑا ہوگا۔ مشکل کشا کی نیاز کے لئے توڑے رہن رکھنا۔ یا مولوی صاحب کا دم کیا ہوا ملیدہ راحت کو کھلانے کی کوشش کرنا کہ یہ ملیدہ مراد برلائے گا۔ توہم پرستی مسلم متوسط گھرانوں کا جز ولاینفک ہے۔ اقتصادی پریشانیوں کی ایک وجہ یہی توہم پرستی بھی ہے۔ پھر بہت سی چیزوں کو ایک دوسرے کے برعکس پیش کر کے وہ کہانی میں بھرپور تاثر پیدا کرتی ہیں۔ مثلاً چوتھی کا جوڑا بیوتنے والی بی اماں کا کفن بیوتنا۔ ملیدہ کھلاتے کھلاتے حمیدہ کا راحت کی ہوس کا نشانہ بننا وغیرہ ایسے منظر ہیں جو کہانی میں تاثر بڑھاتے ہیں۔ عصمت کا فن اختصار کا فن ہے چھوٹے سے جملے میں وہ پوری صورت حال بیان کر دیتی ہیں جیسے ''ابا ایک دن چوکھٹ پر اوندھے منہ گرے اور انہیں اٹھانے کے لئے کسی حکیم یا ڈاکٹر کا نسخہ کام نہ آسکا اور حمیدہ نے میٹھی روٹی کے لئے ضد کرنا چھوڑ دی'' اس چھوٹے سے جملے میں حمیدہ کے یتیم ہونے کا پورا کرب چھپا ہے عصمت کی نسائی حسیت اس درد کو اجاگر کرتی ہیں کہ یتیم بچے کتنی جلد باشعور ہو جاتے یہ بات ان کی سمجھ میں آجاتی ہے کہ ان کے ناز اٹھانے والا اب نہیں رہا اس لئے وہ حالات سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ عصمت نے مسلم متوسط طبقے سے کچھ سوالات بھی کئے ہیں جو لڑکیوں کی ظاہری شکل وصورت پر مرتا ہے۔ وہ حمیدہ کی زبانی پوچھتی ہیں ''یہ ہاتھ جو صبح سے شام تک مسالہ پیستے ہیں پانی بھرتے ہیں پیاز کاٹتے ہیں بستر بچھاتے ہیں جوتے صاف کرتے ہیں یہ بے کس غلام صبح سے شام تک جٹے ہی رہتے ہیں ان کی بیگار کب ختم ہوگی کیا ان کا کوئی خریدار نہ آئے گا؟ کیا انہیں کبھی کوئی پیار

سے نہ چومے گا؟ کیا ان میں کبھی مہندی نہ رچے گی؟ کیا ان میں کبھی سہاگ کا عطر نہ بسے گا؟ جی چاہا زور سے چیخ پڑوں'' یہ چیخ ان لڑکیوں کی چیخ ہے جنہیں نظرانداز کیا جاتا ہے۔ عصمت نے متوسط طبقے کی اس رسم کے بھی بھیانک نتائج دکھائے جہاں یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ سالی اپنے بہنوئی سے مذاق کرے۔ یہ مذاق کتنا خطرناک ہوتا ہے عصمت نے اس کے مضمرات دکھائے ہیں۔ ''چوتھی کا جوڑا'' عصمت کی نسائی حسیت کا ایک شاہکار افسانہ ہے۔

عصمت نے عورت کا جس باریک بینی سے مشاہدہ کیا اس کی کوئی اور مثال اردو ادب میں نہیں ملتی۔ عورت کی پیدائش، بچپن، جوانی، ادھیڑ پن بڑھاپا سارے روپ عصمت نے پیش کئے۔ مختلف ادوار میں عورت کے جذبات واحساسات کیا ہوتے ہیں انہیں بھی عصمت نے محسوس کروایا۔ مختلف طبقات کی لڑکیوں کی نفسیاتی کیفیت اور انداز جدا ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صادق لکھتے ہیں ''شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کا نچلا اور متوسط طبقہ جس میں سانس لیتی ہوئی لڑکیاں جنھیں ان کے معصوم اور شریر بچپن نے اچانک جوانی کے حدوں میں ڈھکیل دیا ہے اور وہ اس نئی عمر کی نئی سرحدوں میں آکر بالکل نئے کیفیات و نئی زندگی سے دو چار ہے اس زندگی کے تجربات نے عجیب قسم کی کیفیت و مستی عجیب طرح کی لذت ہے حیرت ہے کبھی کبھی انجانا خوف۔ عصمت نے زندگی کا گہرا مشاہدہ کیا ہے اس لئے وہ اس کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑتیں۔'' [1]

''جال'' ایک ایسا ہی اہم افسانہ ہے جس کا موضوع بڑا نازک ہے۔ بظاہر ایک معمولی سی بات لاشعور کے کتنی گہرائی میں اتر کر نفسیاتی کیفیات پیدا کرتی ہے اس کی عکاسی کرنا عصمت ہی کا کام ہے اور اس نسائی حسیت کا جو، ان کے فن میں موجود ہے۔ 'جال' ایسی ہی نو عمر لڑکیوں کی کہانی ہے جو اچانک جوانی کی سرحدوں میں پہنچ گئی ہیں۔ ان سرحدوں میں پہنچ کر وہ عجیب وغریب کیفیات، تجربات، جذبات واحساسات سے گذر رہی ہیں۔ اس عمر میں لباس کتنی اہمیت رکھتا ہے اسے عصمت نے کامیابی سے محسوس کروایا ہے۔ لباس

---

[1] صادق ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ ص۔ ۱۶۱

لڑکیوں کے ذہن پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے اور شخصیت کی تعمیر اور تشکیل میں اس کا کتنا اہم حصہ ہے یہی عصمت کا موضوع ہے۔ ان لڑکیوں پر سخت پہرے ہیں ان کی چال پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ آہستہ چلیں بار بار دوپٹہ اوڑھنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ ان لڑکیوں پر گھر کی بزرگ عورتیں اتنی کڑی نظر رکھتی ہیں اتنی بندشیں، رکاوٹیں اور پابندیاں ہیں کہ ان لڑکیوں کا جی چاہتا ہے کہ وہ اس طرح جینے کے بجائے مرجائیں۔ نہانے سے قبل کھلی کے لوتھڑے ان کے سروں پر تھوپ دیے جاتے ہیں تاکہ ان کی جوئیں مرجائیں۔ ملانی ماں ایسے گھسے مارتی ہیں کہ لڑکیوں کا جی چاہتا ہے کاش وہ اپنے بال منڈوا سکتیں انہیں صرف غسل خانے میں پہنچ کر آزادی کا احساس ہوتا ہے لیکن یہ کیفیت بھی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی کیوں کہ ملانی ماں چیخنے لگتی ہیں کہ ''ابھی تک میت نہا نہیں چکی؟'' متوسط طبقے میں سب سے زیادہ پابندیوں کا شکار نوعمر لڑکیاں بنتی ہیں ان کی باجیاں اور آپائیں بڑے مزے کی زندگی گذارتی ہیں ان کے رشتے کے بھائی ان کی فرمائشیں پوری کرتے ہیں تحفے بھیجتے ہیں۔ اور اس کے لئے انہیں نوعمر لڑکیوں کا ذریعہ استعمال کیا جاتا ہے۔ صفیہ اور عظمیٰ اپنی باجی تک تحفہ پہچانے کی بجائے خود رکھ لیتی ہیں۔ اسے کھول کر دیکھنے کے بعد ان کی جو نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے اسے عصمت نے عمدگی سے اجاگر کیا۔ اس تحفے کی وجہ سے دونوں لڑکیوں کے تعلقات میں دراڑ پڑجاتی ہے۔

عصمت نے نوعمر لڑکیوں کے احساسات کا بخوبی مطالعہ کیا ہے۔ ایک معمولی سا لباس ان کے ذہن میں کتنے طوفان اٹھا سکتا ہے اس کی کامیاب عکاسی کی۔ عصمت نے اس پہلو کی جانب بھی مبذول کروائی کہ حبس اور گھٹن میں پرورش پانے والی یہ لڑکیاں اپنے بعض بہت ہی خاص ملبوسات کا تقاضہ اپنے بزرگوں سے نہیں کرسکتیں کیوں کہ یہ خلاف تہذیب ہے اس لئے وہ اپنے رشتے کے بھائیوں کے ذریعہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں اور پھر ساری نگرانیاں، سارے اصول، ساری دیواریں بے وقعت ہوجاتی ہیں۔ لڑکیاں اگر کچھ حاصل کرنے پر آمادہ ہوجائیں تو پھر یہ ساری رکاوٹیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ ان کے

فطری تقاضوں کو یہ مصنوعی بندھن روک نہیں سکتے اس بے جا بندشوں سے طرح طرح کے ذہنی اور جسمانی امراض پھلنے پھولنے لگتے ہیں۔ سڑے ہوئے بدبودار لباس شخصیت کو کچل کرر کھ دیتے ہیں اس کے مقابلے میں نرم و نازک لباس شخصیت میں کتنی تبدیلی لاتے ہیں کیفیات کا اظہار عصمت نے بڑی عمدگی سے کیا ہے ان کی نسائی حسیت تیز اور مشاہدہ دور رس معلوم ہوتا ہے۔

''دوسرے لمحے وہ پرُ پرُزوں سے آزاد ٹھنڈے اوس میں بھیگے ہوئے پھولوں کے جال میں جکڑ گئی۔ ایسا معلوم ہوا وہ اوپر اٹھنے لگی۔ اوپر بہت اونچی۔ ہلکی پھلکی مہکتی ہوئی تیتری کی طرح! سانس زور مور سے چلنے لگی۔ آنسوں کی چلمن نے گلابی پھولوں کے تختے کو جھومتے دیکھا۔''

اس نفسیاتی کیفیت کو لفظوں کے پیکر میں ڈھالنا معمولی بات نہیں ان ہلکی ہلکی لرزشوں کو گرفت میں لانے کے لئے جس فنی بصیرت، خلوص، جرات ان سب سے بڑھ کر نسائی حسیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ عصمت کے پاس موجود ہے۔

ڈاکٹر صادق لکھتے ہیں ''عصمت کے افسانے زندگی کی فصل ہیں۔ وہ جاگیرداری اور زمین داری کے زوال کے بعد کے شمالی ہند کے مسلم گھرانوں کی زندگی ہے جو اقتصادی پسماندگی کے سبب اخلاقی زوال سے دوچار ہے جس میں سب کچھ بکھرتا بدلتا جارہا ہے اس معاشرے میں سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت عورت کی ہے جو مرد کے ہاتھوں تشکیل دیے ہوئے نظام میں ایک نرم و نازک اور خوبصورت کھلونے سے زیادہ نہیں ہے۔ اسے تعلیم سے محروم رکھ کر جہالت، اوہام پرستی، عفت شعاری، قناعت اور پاکیزگی کی تلقین کی جاتی ہے جہاں اس کے لئے فرائض ہی فرائض ہیں ایثار ہے عصمت نے اپنے افسانوں کے ذریعہ اس حصار کو توڑنے کی سعی کی ہے وہ مرد کی جھوٹی آن بان پر ہنسنے اور اس کی عیاشی اور مکاری پر طنز کرنے، اس کی خود پرستی انا کو کچوکے لگانے کا ہنر جانتی ہیں خود عورت کی کورانہ جذباتیت اور کمزوری پر وہ بڑی بے دردی سے ضرب لگاتی ہیں۔ عورت کو اس کی حقیقی شکل میں اتنی جرات

مندی اور بے باکی کے ساتھ صرف عصمت ہی پیش کر سکتی ہیں'' [1]

''لحاف'' عصمت چغتائی کا وہ بدنام افسانہ ہے جسے سب سے زیادہ حدفِ ملامت بنایا گیا۔عزیز احمد اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں عصمت چغتائی کے بارے میں لکھتے ہیں'' عصمت چغتائی کو ترقی پسندوں میں شمار کرنا ترقی پسندوں کی محض سرپرستی اور خاتون پرستی ہے ان کا رجحان ''سعادت حسن منٹو'' سے بھی زیادہ رجعت پسند انداز مریضانہ ہے.......... ایک طرح کے غیر معمولی نفسیاتی جنس پرستی ان کے ذاتی نفسیِ احساس کو اتنا ابھارا ہے کہ ساری دنیا میں آپ ہی آپ کو دیکھتی ہیں یا ساری دنیا میں ایسی ہی چیزیں نظر آتی ہیں جن کے سبب سے بڑی قدر جنس کی بے راہ روی گمراہی، غلط روی ہے بجائے اس کے وہ اپنی ہم جنس لڑکیوں کی پوری زندگی کے ہر پہلو کا معائنہ کرتیں انہیں ہر طرف جنس ہی جنس نظر آتی ہے جنس کے متعلق طرح طرح کے امکانات ان کی نظر پر حاوی ہیں۔لحاف، بھول بھلیاں، جال اس قسم دوسرے افسانوں کی واقعیت سے انکار کرنا تو محض حماقت ہوگی لیکن سوال یہ ہے کہ زندگی کی ان غلط کاریوں کو ان افسانوں میں کس طرح پیش کیا گیا ہے کہ ترغیب کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ان کا انجام اور زیادہ گمراہی کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے اگر عصمت چغتائی کو ان ہی حقائق سے زیادہ واقفیت تھی تو انہیں کم سے کم ان واقعات کو اس طرح پیش کرنا چاہیے تھا کہ کراہیت ترغیب پر غالب آجائے حقیقت نگاری کا اصل مقصد زندگی کے نت نئے امکانات پیدا کرنا ہے نا کہ پرانے زخموں کو کرید کرید کر انہیں اور زیادہ سڑانا'' [2]

'لحاف' کے بارے میں خلیل الرحمٰن اعظمی کا خیال ہے کہ وہ اس افسانے میں اپنے فن سے عہدہ برا نہیں ہو سکی ہیں'' [3]

پطرس کے خیال میں ''اس کہانی کی قیمت یوں گھٹ جاتی ہے کہ اس کا مرکز ثقل

---

[1] جال۔	''ایک بات''	ص۔۷۵
[2] عزیز احمد	ترقی پسند ادب	ص۳۰۳۔۳۰۶
[3] خلیل الرحمٰن اعظمی	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	ص۔۲۲۸

کوئی دل کا معاملہ نہیں بلکہ ایک جسمانی حرکت''۔[1]

ڈاکٹر صادق کا خیال ہے ''عصمت چغتائی نے اس افسانے میں نواب کے کردار کے ذریعہ اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے ایک مرد کا غیر فطری جنسی طریق سیدھی سادی گھریلو عورت کو کیسی غلط اور غیر فطری راہ پر ڈال سکتا ہے۔ اس افسانے کی قدر و قیمت اس لئے بڑھ جاتی ہے کہ عصمت نے پورا افسانہ اپنی یا بیگم جان کی نہیں بلکہ ایک کمسن اور معصوم بچی کی زبانی بیان کیا ہے اس میں ایک شوخ اور معصوم تجسس بھی ملتا ہے لیکن اس تجسس کو تلذّذ کا نام ہرگز نہیں دیا جا سکتا۔[2]

''لحاف'' عصمت چغتائی کا بدنام ترین افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ان کے نام کا حصہ بن گیا تھا انہیں لحاف والی عصمت چغتائی کہا جانے لگا تھا۔ نسائی حسیت کے اعتبار سے یہ عصمت کا ایک اہم افسانہ ہے۔ عزیز احمد نے عصمت پر سخت تنقید کی۔ ان کا یہ کہنا بڑی حد تک درست نہیں کہ غیر معمولی نفسیاتی جنس پرستی میں ان کے ذاتی نفسی احساس کو اتنا ابھارا کہ وہ ساری دنیا میں اپنے آپ ہی کو دیکھتی ہیں یا ساری دنیا میں ایسی ہی چیزیں انہیں نظر آتی ہیں جن کی سب سے بڑی قدر جنس کی بے راہ روی، گمرہی اور غلط روی ہے۔ اس بات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے کیوں کہ عصمت کے موضوعات میں تنوع ہے انہوں عورتوں کے بے شمار مسائل پر لکھا جس میں ایک موضوع جنسی گھٹن یا گمراہی بھی ہے۔ البتہ عزیز احمد نے یہ سچ لکھا کہ وہ ساری دنیا میں اپنے آپ ہی کو دیکھتی ہیں۔ عصمت نے عورت ہونے کے ناطے ہر عورت کے درد کو اپنا درد سمجھا اور نفسیاتی کیفیتوں کو کامیابی سے برتا۔ لحاف کا موضوع ہم جنس پرستی ہے اس پر لکھتے ہوئے مرد افسانہ نگاروں کے قلم بھی کانپ اٹھتے ہیں لیکن عصمت نے اپنے فن اور شدید نسائی حسیت کے سہارے پہ آگ کا دریا پار کر گئیں۔

عصمت نے ساری باتیں اشاروں اور علامتوں کے ذریعہ بیان کی ہیں اگر

---

[1] بحوالہ خلیل الرحمٰن اعظمی — ترقی پسند ادبی تحریک — ص۔ ۲۲۹

[2] صادق — ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ — ص۔ ۱۶۱

پڑھنے والے کے ذہن میں پہلے ہی سے کوئی بنا بنایا تصور نہ ہو تو وہ افسانے کے واقعات کو اس طرح سمجھ نہ پائے گا جس طرح کہانی کی راوی لڑکی سمجھ نہیں پائی۔ ان مسائل کو کسی عورت نے اپنے نقطہ نظر سے پیش ہی نہیں کیا تھا۔ جب سارے ماحول پر نظر ڈالی جائے تو 'لحاف' کی بیگم جان سے نفرت نہیں بلکہ ہمدردی ہوتی ہے۔ عصمت کی نسائی حسیت کا کمال یہ ہے کہ پڑھنے والے کو بیگم جان سے نہیں بلکہ نواب صاحب سے نفرت ہوتی ہے۔ عصمت نے بیگم جان اور نواب صاحب کی شادی کی وجہ اقتصادی کمزوری کو بتایا ہے۔ بیگم جان غریب ہے اس لئے وہ پکی عمر کے نواب صاحب کے پلے باندھ دی جاتی ہیں۔ خود نواب صاحب حاجی تھے اور بہنوں کو بھی حج کروا چکے تھے نواب کی مذہب پرستی کے پیچھے کتنا گھناؤنا پن چھپا ہوا تھا اسے عصمت نے بے نقاب کیا۔ بیگم جان سے نواب صاحب نے اس لئے شادی کی تھی کہ ان کا گھناونا پن چھپا رہے اور بیگم جان کی آڑ میں اپنی حرکتیں جاری رکھ سکیں۔ بیگم جان بالکل معصوم ہے۔ ان کی شادی میں ان کی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ انہیں ایک پکی عمر کے بوڑھے کے گلے منڈھ دیا گیا ہے اس کے باوجود وہ ایک نیک بی بی کی طرح نواب صاحب کو اپنی جانب راغب کرنے کی پوری کوشش کر دیکھتی ہے۔ سارے حربے بیکار ہو جاتے ہیں تو چلّے اور وظیفہ خوانی تک کرتی ہے۔ نواب صاحب سے مایوس ہو کر وہ علم کی جانب متوجہ ہوتی ہے لیکن وہاں اس کا دل نہیں لگتا۔ نواب صاحب نے ایک غریب معصوم لڑکی کی زندگی برباد کر دی جبکہ انہیں عورت سے کوئی دلچسپی نہ تھی انہوں نے بیگم جان پر پہرے بٹھا دیے تھے اور ایک طرح سے انہیں قید کر رکھا تھا۔ ان کے رشتے دار آ کر رہتے تو نواب صاحب ان کی خوب خاطر مدارت کرتے۔ بیگم جان کے درد کو کوئی نہیں سمجھتا تھا۔ ان حالات میں عورت یا خودکشی کر سکتی ہے یا گھر چھوڑ کر بھاگ سکتی یا پھر غلط راہ اختیار کر سکتی ہے۔ بیگم جان میں خودکشی کی ہمت نہ تھی یا مواقع نہ تھے۔ گھر چھوڑ کر وہ کہاں جاتیں ان کا میکہ غریب تھا۔ چنانچہ وہ ربّو میں پناہ ڈھونڈتی ہیں۔ کہانی کی راوی لڑکی بیگم جان سے اس وقت ملتی ہے جب ان کی عمر چالیس برس ہوتی ہے۔ عصمت نے پورا افسانہ ایک نو عمر

لڑکی کی زبانی بیان کیا ہے۔ ان کی نسائی حسیت اس لڑکی کی ذہنی کشمکش کو حقیقی انداز میں پیش کرتی ہے۔ لڑکی سوچتی ہے۔

"اماں کو ہمیشہ سے میرا لڑکوں کے ساتھ کھیلنا ناپسند ہے۔ کیوں بھلا لڑکے کیا شیر چیتے ہیں جو نگل جائیں گے ان کی لاڈلی کو۔ اور لڑکے بھی کون؟ خود بھائی اور دو چار سڑے سڑائے ذرا ذرا سے ان کے دوست مگر نہیں وہ تو عورت ذات کو سات تالوں میں رکھنے کی قائل اور یہاں بیگم جان کی وہ دہشت کہ دنیا بھر کے غنڈوں سے نہیں۔ بس چلتا تو اس وقت سڑک پر بھاگ جاتی پر وہاں نہ ٹکتی۔ مگر لاچار تھی مجبوراً کلیجے پر پتھر رکھے بیٹھی رہی![1]

عصمت نے اس لڑکی کی نفسیاتی کیفیت کا بخوبی مطالعہ کیا جو مردوں سے زیادہ بیگم جان سے ڈرتی ہے۔ عورت اتنی حساس ہوتی ہے کہ وہ فوراً خطرے کو محسوس کر لیتی ہے۔ پھر لڑکوں کے ساتھ کھیلنے سے منع کرنے والے یہ نہیں جانتے کہ خرابی عورتوں کے ہاں بھی پائی جا سکتی ہے۔ عزیز احمد کا یہ کہنا غلط ہے کہ اس طرح کے افسانوں میں ترغیب کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ یہاں ترغیب بالکل نہیں ملتی بلکہ دہشت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ دہشت جو راوی لڑکی محسوس کرتی ہے وہی قاری بھی محسوس کرتا ہے۔ بیگم جان کا مرض اتنا خطرناک ہو گیا ہے کہ اس معصوم لڑکی کو بھی اس طوفان کی لپیٹ میں لینا چاہتی ہیں جس نے ان کی زندگی کو تہس نہس کر دیا تھا۔ کہانی کا کلائمکس عصمت نے اشاروں میں بیان کیا ہے جو بالغ ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ ایک معصوم لڑکی کی سوچ کا نتیجہ ہیں۔ اس موضوع پر لکھ کر عصمت نے معاشرے کے ایک گھناونے پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس حقیقت سے وہ آنکھ نہیں چار کرتیں اسے اس طرح پیش کرتی ہیں کہ پڑھنے والا کراہیت محسوس کرے۔ وہ واقعات کا جواز بھی پیش کرتی ہیں کہ بے جوڑ شادی اور بدکردار شوہر عورت کو کس پستی میں پہنچا دیتے ہیں۔ عصمت نے اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کیا اس افسانے کے ذریعہ ایک طرح سے ان ساری لڑکیوں کو خبردار کیا جو ماں باپ کی مرضی کے آگے گائے بھینسوں کی طرح کسی بھی

---

[1] لحاف — چوٹیں — ص۔ ۹۳

کھونٹے سے بندھ جاتی ہیں اور بے جوڑ شادیوں کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کرتیں۔ بظاہر مذہب پرست لیکن بدکردار مردوں کا پول نہیں کھولتیں۔ اور فطری تقاضوں سے مجبور ہو کر غلط راہ اختیار کرتی ہیں۔ بیگم جان ایک ایسا ہی کردار ہے جس کا تعلق غریب خاندان سے ہے جس طبقے میں مالی خوشحالی کو سب سے زیادہ ترجیح دی جاتی ہے اور دوسرے فطری تقاضوں کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ بیگم جان تعلیم یافتہ بھی نہیں ہے۔ نہ اس میں اتنی ہمت ہے کہ نواب صاحب سے علیحدگی اختیار کر سکے کیوں کہ معاشرے میں ایسی لڑکیوں کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ علیحدگی کا حق عورت کو مذہب نے دیا ہے لیکن مالی مشکلات، جھوٹی شرافت کی برقراری کے لئے وہ ایسا کوئی اقدام نہیں کرتی جس کے نتیجے میں اس کی زندگی بالکل دوسرا رخ اختیار کرتی ہے۔

عصمت چغتائی کے بارے میں مولانا صلاح الدین کی یہ رائے اہمیت کی حامل ہے ”یہ ہمارے ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اسے صنف نازک میں سے ایک ایسی لکھنے والی میسر آئی جس نے نہ صرف اس روایتی بناوٹ، تکلف اور خوف کو یکسر دور کر دیا جس نے اس طبقے کی روح کو دبا رکھا تھا بلکہ ژرف نگاہی اور حق پرستی سے ہمیں انسانی فطرت کی ان نازک اور لطیف ترین کیفیتوں سے آشنا ہونے میں مدد دی جن تک تیز سے تیز مرد صاحب قلم کی رسائی محال نظر آتی ہے۔“ [1]

جنسی مسائل پر لکھنے میں عصمت کو غیر معمولی دسترس حاصل ہے وہ اپنی غیر معمولی صلاحیت کے سہارے بہت سے نازک مقامات سے گذر جاتی ہیں۔

عصمت پر سخت اعتراضات کئے گئے مضامین لکھے گئے کہ وہ صرف جنس پر لکھتی ہیں صرف جنس پر ــــ عصمت نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ دراصل ذہن گندے ہوتے ہیں قلم نہیں ایک کہانی ”ننھی سی جان“ لکھی۔ اس میں ایک مردہ بچے کا تذکرہ ہے جسے گھر کی نوکرانی کی لڑکی نے خون بھرے چیتھڑے میں لپیٹ کر دفن کر دیا تھا۔ گھر کا ایک نوکر لڑکا

---

[1] پنڈت کشن پرشاد کول نیا ادب طبع اول کراچی ص۔۲۰۲

اس بچے کے لئے ذمہ دار ہوتا ہے۔ آخر میں پتہ چلتا ہے کہ وہ مرغی کا بچہ تھا جو لڑکی دروازہ بند کر رہی تھی تو کچل کر مر گیا تھا۔

فضیل جعفری اس افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں ''پوری کہانی میں مکالموں کا انداز، لڑکیوں کا سہا ہوا لہجہ مرکزی کردار رسولن کے طور طریقے ایسا سماں باندھتے ہیں کہ عصمت کے افسانوں سے واقف کار قاری جائز طور پر ایک ناجائز بچے کے متعلق Curious ہو جاتا ہے لفظ بہ لفظ اور جملہ بہ جملہ رسولن کے ناجائز بچے کے متعلق یقین ہوتا چلا جاتا ہے .... میں سمجھتا ہوں کہ تکنیک کے اعتبار سے یہ افسانہ جنسی Force کی بہترین مثال ہے۔'' [1]

عصمت نے دانستہ طور پر ایسی سچویشن بنائی ہے کہ جگہ جگہ شبہ ہوتا ہے وہ اس شبے کو تقویت پہنچانا چاہتی ہیں۔ یہ افسانہ کسی نسائی مسئلے پر لکھا گیا اور نہ کسی مقصد کے تحت۔ اگر کوئی مقصد ہے تو وہ یہ کہ پڑھنے والوں پر گندہ ذہن ہونے کا الزام ثابت کیا جائے۔ لیکن اس میں متوسط طبقے کی نسائی حسیت ملتی ہے۔ ظاہر ہے ہر طبقے کی نسائی حسیت مختلف ہوتی ہے۔ نچلے طبقے کی لڑکیوں کو جو آزادی حاصل ہے اس سے متوسط طبقے کی لڑکیاں محروم ہیں۔ وہ اپنے پر لگائی گئی پابندیوں کے بارے میں سوچتی ہیں اور اپنا تقابل نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی ملازمہ سے کرتی ہیں۔

''رسولن نوکرانی تھی پر وہ بچپن سے دوست ہی رہیں۔ اور ویسے تھوڑی بہت رسولن ہی مزے میں تھی۔ وہ پردہ نہیں کرتی تھی اور مزے سے دوپٹہ پھینک کر آم کے پیڑ تلے کودا کرتی ان دونوں جب سے ان کے ماموں رامپور سے آئے تھے پردے میں رہتی تھیں اور گلاب ساگر والی نانی نے آ کر سب کو موئی کلف دار ململ کی اوڑھنیاں بنا دی تھیں اور باہر قدم رکھنا جرم تھا یہ رسولن ہی تھی جوان پر رحم کھا کر دو چار کوئل ماری امیاں انہیں بھی کھڑکی سے دیتی تھی جہاں وہ پر کٹے طوطوں کی طرح ٹکر ٹکر دیکھا کرتی تھیں اور ماموں کی

---

[1] فضیل جعفری۔ عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری۔ اردو افسانہ روایت اور مسائل ص۔۴۳۴

مونچھ کی نوک بھی دکھ جائے تو وہ غڑاپ سے پیچھے کود پڑتیں۔ [۱]

عصمت نے مسلم متوسط طبقے کی لڑکیوں کی گھٹن کا اظہار کیا۔ ان کا مشاہدہ تیز ہے۔ ''ایک بات'' کے دیباچے میں عصمت نے ایک شاعر کا حوالہ دیا جس نے یہ سوال اٹھایا کہ جو ادیب فحش نگاری کرتے ہیں کیا ان کی بہنیں نہیں ہوتیں؟ عصمت کہتی ہیں ''ان حضرت سے دست بستہ عرض ہے کہ قبلہ اگر ماں، بہن نہ ہوتیں تو مشاہدہ کہاں ہوتا'' عصمت اس پر اصرار کرتی ہیں کہ انہوں نے اپنے بیشتر افسانوں کا مواد اپنے گھر سے حاصل کیا۔ ان کے بیشتر افسانے ان کے اپنے مشاہدات اور تجربات پر مبنی ہوتے ہیں۔ وہ کہتی ہیں ''میں لکھتے وقت یہ نہیں سوچتی کہ یہ جملہ فلاں شخص کے منہ سے نکلا ہے وہ عام انسان کے سننے کے لائق ہے کہ نہیں ہے۔ میں اس کو ویسے کا ویسا اپنے قلم سے لکھ دیتی ہوں کیوں کہ میں مصور نہیں ہوں فوٹو گرافر ہوں'' [۲]

''تل'' میں عصمت نے ایک الھڑ اور جوان لڑکی کی بے باکانہ اداؤں کی خوبصورت غمازی کی ہے۔ رانی ایک الھڑ جوان لڑکی ہے جسے چودھری اپنی ماڈل بناتا ہے تاکہ پانچ ہزار روپے کا انعام حاصل کر سکے۔ لیکن رانی کی جوانی کو وہ رنگوں میں قید نہیں کر پاتا۔ وہ اس کے قابو میں ہی نہیں آتی۔ رانی اسے جسم کے خاص حصے پر جو تل ہوتا ہے وہ دکھاتی ہے اور پھر بات میں بات پیدا کر کے اپنے عاشق رتنا اور چنّن کے بارے بتاتی ہے۔ چودھری عجیب کشمکش میں پڑ جاتا ہے ایک تو رانی کی جوانی کو رنگوں کی گرفت میں لینا ناممکن نظر آتا ہے دوسرے اس کی باتیں اور بے ساختہ ادائیں۔ چودھری اس کی ٹوہ میں رہتا ہے۔ لیکن رانی ایک روز غائب ہو جاتی ہے۔ تصویر ادھوری رہ جاتی ہے چودھری پریشان رہنے لگتا ہے اور ڈر کے مارے کسی سے نہیں کہتا کہ رانی بھاگ گئی۔ اس کے بعد وہ تصویر بنانا ہی بھول جاتا ہے لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں کہ چودھری رانی کو بیچ آیا، ایک سوداگر

---

[۱] ننھی سی جان۔ ایک بات ص ۱۸۔۱۹

[۲] عصمت چغتائی سے ایک ملاقات۔ شاعر جلد ۴۷۔ شمارہ ۳ ص ۱۴

آیا تھا جو کئی ہزار دے کر لے گیا، رانی سے برا تعلق۔ ناجائز کہیں ہار کر دیا۔ ایک روز رانی ایک خون آلود گٹھری ایک الگ سے راستے میں رکھتی ہوئی پکڑی جاتی ہے اور پولیس کے ہتھے چڑھ جاتی ہے۔ چودھری ڈرتا ہے کہ اس کی ساری عمر کی پاکبازی اور نیک نیتی مٹی میں مل جائے گا۔ لیکن عدالت سے وہ بری ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ جس طرح سے چھوٹا ہے اسے سوچ کر اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ کم سے کم شریک جرم رہتا اور دنیا بھر کی ذلتیں اُٹھاتا مگر اس طرح بَری نہ ہوتا کیوں کہ بھری عدالت میں رانی کہتی ہے کہ وہ بچہ چودھری کا نہیں تھا۔ رتنا سے پوچھو یا چتن سے — چودھری تو ہیجڑا ہے —'' یہ سن کر چودھری پاگل ہو جاتا ہے اور سڑک کے کنارے کویلے سے لکیریں کاڑھنے لگتا ہے۔

عصمت نے ایک ادھیڑ عمر کے فن کار مرد کی نفسیات کا بخوبی مطالعہ کیا ہے۔ جو گناہ نہ کر کے بھی ایک عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔ دوسرے مردوں پر اسے رشک آتا ہے وہ ان سے حسد کرتا ہے۔ لیکن دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تلّیا پر جاتا ہے رانی کو نہاتے دیکھتا ہے۔ وہاں رتنا بھی ہے۔ رانی اس سے اٹکھیلیاں کرتی ہے وہ واپس آ جاتا ہے اور مارے غصے کے رتنا کو نوکری سے نکال دیتا ہے۔ وہ اس کی کوٹھری تک بھی جاتا ہے۔ رانی کی غیر موجودگی میں اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آتے ہیں لیکن سامنے وہ اچانک ہی بزرگانہ رویہ اختیار کر لیتا ہے۔ مرد کی دورنگی۔ اس کی کیفیات اور لڑکی کی جوانی کے سیلاب کے آگے قدم جمائے کھڑا رہنے کی کوشش اور اس کوشش میں ذہنی قلابازیاں کھانا۔ خواہش اور سماج کی بندشوں کا ٹکراؤ — دوسری طرف نچلے طبقے کے سیدھے سادھے کردار ہیں اکہرے — ان کا ظاہر اور باطن ایک ہے۔ چوری جھوٹ اور کپٹ نہیں ہے وہ کسی ذہنی یا نفسیاتی کشمکش سے دوچار نہیں جھوٹی عزت کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتے۔ رانی بڑے اطمینان سے رتنا اور چتن سے تعلقات کے قصے سناتی ہے وہ تو چودھری کو بھی رجھاتی ہے لیکن جھوٹی آن، عزت اور سماج کے حوف سے چودھری ہمت نہیں کر پاتا۔ رانی کو اپنی جسم کی قدر و قیمت کا بھرپور احساس ہے۔ اور یہ بھی جانتی ہے کہ اس مردانہ معاشرے میں

سب سے زیادہ قدر و قیمت عورت کے جسم کی ہے۔ چنانچہ وہ چودھری کے آگے بڑی بے باکی سے جسم کی نمائش کرتی ہے وہ جسم کا ایک ہی مصرف جانتی ہے آرٹ کے اس کے پاس کوئی معنی نہیں۔ چودھری کے بارے میں اس کی جو رائے ہے وہ اس کے اپنے تجربے کا نتیجہ ہے۔ جس کا اظہار وہ بھری عدالت میں بے محابہ کرتی ہے۔ عصمت نے ایک بے باک عورت اور تضع سے پُر مہذب معاشرے کے مرد کی عکاسی کی ہے۔ شر اور خیر کی جو اضافی صورتیں ہیں اسے پیش کیا۔ چودھری کے ضبط اور نیکی کی رانی کے پاس کیا حیثیت ہے اسے دکھایا۔ چودھری کی ذہنی کشمکش کو انہوں نے خوبصورتی سے پیش کیا اور بڑے فن کارانہ انداز میں یہ ثابت کیا کہ جوانی کو رنگوں میں قید نہیں کیا جا سکتا وہ لکھتی ہیں ''جسے اس نے موری کی غلاظت سے اٹھا کر اپنے شاہکار کے لئے چنا تھا اس کے قابو میں نہ آئی سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ ہزاروں رنگ لتھیڑنے پر بھی وہ اس کے جسم جیسا مسالہ تیار نہ کر سکا۔ اس نے سیاہی میں صندل گھول کر اس میں نیلا رنگ ملا دیا پھر بھی اس کے رنگ کی چمک آبنوسی صندلی نیلی اور کچھ بادامی لہر لئے ہوئے تھی۔ ایک مصیبت ہوتی تو خیر۔ آج اس کا رنگ سرمئی ہوتا تو دوسرے دن اس میں شفق کی سرخی پھوٹنے لگتی اور پھر اچانک اس کا جسم ختم ہوتی ہوئی رات کی طرح اودی اودی گھٹاؤں سے ملنے لگتا اور کبھی نہ جانے کہاں سے اس میں سانپ کے زہر کی سی نیلاہٹ جھلکنے لگتی اور آنکھیں بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتیں۔''

عورت کی بصارت بڑی تیز ہوتی ہے۔ عصمت نے بہت ہی فن کارانہ انداز میں بصری پیکر بنائے ہیں۔ ان کیفیات کو لفظوں کے ذریعہ ظاہر کرنا ان کی نسائی حسیت کا کرشمہ ہے۔ ایک عورت ہی ان ساری نزاکتوں کو اپنے مشاہدے کی قوت سے محسوس کر سکتی ہے۔

عصمت نے جنس پر ہی نہیں بلکہ گھر کی چار دیواری کی اندر کی دنیا اور صنعتی شہروں کی دنیا کے بارے میں بے شمار افسانے لکھے۔ بین فرقہ جاتی شادیاں بین طبقاتی شادیاں، ملازمت کرنے والی بیویاں، عورت کی جسمانی نگہداشت کی ضرورت ایسے کئی مسائل کو موضوع بنایا۔

''کافر'' میں بین فرقہ جاتی شادی کا مسئلہ ہے۔ عصمت نکاح شادی، مہر، طلاق سب کا مذاق اڑاتی ہیں وہ شادی کو کاغذی کارروائی نہیں بلکہ دل کا معاملہ سمجھتی ہیں۔ لڑکا اور لڑکی دونوں دو مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں بھاگ جاتے ہیں۔ لڑکے کے ساتھ لڑکی کے بھاگنے کے تصور کو عصمت نے الٹ کر رکھ دیا۔ لڑکی کہتی ہے ''یہ مشہور ہو جائے گا کہ میں بھاگ گئی۔''

''نہیں بلکہ میں تیرے ساتھ بھاگ گیا۔ اٹھ جلدی ہاں۔ تجھے کچھ لہر دہر کیا ہوتا ہے۔ وہ چاہیے۔ میں رجسٹری کرادوں گا۔''

''مہر میں تجھے خود دوں گی میری تنخواہ تجھ سے ذرا سی ہی تو کم ہے۔''

''اچھا اٹھ مہر دے''

''مگر جب جی چاہا طلاق دے دیں گے''

''یہ بھول ہے تو تو ہر وقت لڑتی رہتی ہے گھڑی میں سات طلاقیں دے گی چل جلدی ساڑھی بدل''۔ [1]

سماج کے مروجہ اقدار کا وہ مذاق اڑاتی ہیں۔

''خدمت گار'' میں کہانی کی 'میں' دولت مند ہے اور رشید سے شادی کرنے تیار ہے جو چالیس برس کا ہے۔ اس کے والد کے بے تکلف دوستوں میں سے ہے جنھیں وہ رشید چچا کہا کرتی تھی۔ لیکن بہادر جوان کے ہاں ڈرائیور اس سے محبت کرتا ہے اور محبت کا احساس دلانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اس کے برخلاف ''ہیرو'' میں نچلے طبقے کا سکھا اونچے طبقے کی حمیدہ سے پیار کرنے لگتا۔ لیکن وہ غلط فہمی کا شکار ہے کیوں کہ حمیدہ اپنے ہی طبقے کے اصغر سے پیار کرتی ہے۔ عصمت نے ایک ملازم کے جذبات کی خوبصورت عکاسی کی ہے جیسے سکھا کا حمیدہ کی جھوٹی پلیٹ میں کھانے کی خواہش کرنا، اس کے میلے کپڑے دھونے کی کوشش کرنا اور طرح

---

[1] کافر — کلیاں — ص۔ ۲۴۳

طرح کے خواب دیکھنا اور حمیدہ کو اصغر میاں سے بچانے کی کوشش کرنا عصمت کی انسانی نفسیات پر مضبوط گرفت کا ثبوت ہے۔

عصمت نے عورت کا ایک بہت ہی نازک اور اہم مسئلہ پیش کیا۔ ہندوستانی عورت شادی کے بعد یہ فرض کر لیتی ہے کہ اب اسے بجنا سنورنا اور اپنے جسم کا خیال رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس لئے وہ بے تحاشہ موٹی ہوئی جاتی ہیں اور شوہر دوسری عورتوں میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ اس موضوع پر عصمت نے دو افسانے مختلف زاویے سے لکھے۔ ایک افسانہ ''بیڑیاں'' ہے دوسرا ''چٹان''—!

''بیڑیاں'' میں جمیلہ اور وحید کا بہت ہی خوش باش جوڑا ہے۔ جمیلہ کے ساتھ ملانی بی بھی رہتی ہیں جن کا یہ خیال ہے کہ جمیلہ کو اولاد ہو جائے تو پھر وحید کے پاؤں میں بیڑیاں پڑ جائیں گی۔ لیکن جمیلہ اس کے برعکس سوچتی ہے۔ وہ جانتی ہے اس کے شوہر کو بھرے جسم کی متناسب الاعضا عورت پسند ہے وہ موٹی بھدی اور سوکھی سہی لڑکیوں کا بُری طرح مذاق اڑاتا ہے۔ جمیلہ ماں بننے والی ہوتی ہے اسے خوف ہے کہ ماں بننے کے بعد اس کے جسم کا سڈول پن باقی نہیں رہے گا اور وہ وحید کو کھو دے گی وہ جسمانی کشش کو مرد کے پاؤں کی بیڑیاں سمجھتی ہے۔ وہ ماں بننے کا ارادہ ترک کر دیتی ہے۔

مختلف ممالک میں نسائی تحریک سے تعلق رکھنے والی عورتوں نے اپنے حقوق میں اس بات کا مطالبہ کیا ہے کہ عورت اپنی مرضی سے ماں بنے گی اسے ابارشن کا اختیار دیا جائے اور بیشتر ممالک نے عورت کے اس حق کو تسلیم کر لیا ہے عصمت کی نسائی حسیت نے اسے برسوں پہلے محسوس کر لیا تھا۔ جمیلہ سوچتی ہے۔

''شادی کرتا ہے انسان شوہر کے لئے ورنہ بچے ویسے بھی مل سکتے ہیں اور پھر یوں بھی جب چاہو جب انسان ہی کیا کتے، بلی، بندر جس کے بچے چاہو دم کے ساتھ لگا لو دمہ بن جائے گا اور پھر یہی چند مہینوں کی بات ہوتی ہے اور بات تھی وہاں تو ساری عمر کے رٹے گھسے اور دھونیاں لو اور اوپر سے بلّی کی پیاؤں پیاؤں۔''

جمیلہ کو سب سے زیادہ اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ وہ دولت جس کے دبدبے سے وہ وحید کے دل ودماغ پر راج کرتی ہے لٹ جائے گی۔ چنانچہ وہ ڈراونے خواب دیکھتی ہے۔

''اس کے جسم کی جاگیر پر لٹیرے ٹوٹ پڑے اور اس کے وجود کو دیمک کی طرح چاٹ لیا۔ دو چار جوڑوں کی طرح بالوں میں قلابازیاں لگائیں گلے چند ایڑیاں دھمکاتے اس کی موتی جیسی آنکھوں کی جلد کو کھرچنے دو چار نے ہتھوڑیاں لے کر دانتوں کا کھلیان کر دیا اور دم بھر میں منہ کھنڈر بن گیا بڑے بڑے آہنی آواز چلا کر انہوں نے اس کی ہڈی کی ایک ایک گرہ جھنجھوڑ ڈالیا اور وہ پچکی ہوئی مشکل کی طرح بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ بے سدھ ہو گئے جیسے بجھی ہوئی لکڑیاں! وہ لمبی جیسے چوٹی کوڑھ ماری چپکلی بن گئی۔''

عصمت نے عورت کی نفسیات کا بخوبی مطالعہ کیا ہے۔ جمیلہ وقت پر جاگتی ہے اور ملانی بی کے صدیوں کے تجربے کو شکست ہوتی ہے جمیلہ موت کے منہ میں جا کر اپنے آپ کو بچا لیتی ہے۔ صدیوں کی بیڑیاں توڑتی ہے۔ جمیلہ اپنی مرضی سے ماں بننے کا ارادہ ترک کر دیتی۔ عصمت بچوں سے زیادہ جسمانی خوبصورتی کو ترجیح دیتی ہیں اور عورت کا خوبصورت بنے رہنے اس کا حق سمجھتی ہیں۔ جمیلہ کے روپ میں وہ ایک باشعور اور باغی لڑکی کو دیتی ہیں جو اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنا چاہتی ہے۔

دوسری طرف ایسی لڑکیاں ہیں جو شادی کے بعد اپنے جسم (Figure) کا خیال نہیں رکھتیں اور اس کے برے نتائج بھگتنا پڑتا ہے۔ عصمت نے عورت کی بے چارگی اور بے بسی کی تصویر کھینچی۔ جس میں معاشرہ ایک ایسے راستے پر لے جاتا ہے جس کا انجام خوف ناک ہے۔ لڑکی جب بہو بن کر آتی ہے تو بہت ہلکی پھلکی، قلانچیں بھرنے والی ہرنی کی طرح ہوتی ہے مگر سسرال اور مائیکہ دونوں طرف سے اور خود شوہر کی طرف سے یہی کوشش کی جاتی ہے کہ اسے پکی گھر گرہستن بنا دیا جائے نتیجہ میں چار پانچ برس کے اندر عورت تین بچوں کی ماں بن کر بھدی اور بے ڈول ہو جاتی ہے اس کی ساس اسے مرغن غذائیں اور ٹانک پلا پلا کر خوب صحت مند بنا دیتی ہے وہ لڑکی جو بہت ہی پیاری سجل نقشہ رکھنے والی مکھن جیسی رنگت

سڈول ہاتھ پاؤں والی ہے اپنے آپ سے لاپرواہی برتنے لگتی ہے کہ اس کا شوہر جو اس سے عمر میں نو برس بڑا ہے اس کے سامنے بچہ معلوم ہوتا ہے۔ جسم کا بھدا پن اور گھر کا ماحول .... اچھے لباس کی خواہش کو بھی مردہ کر دیتے ہیں۔ وہ زیادہ تر ڈریسنگ گاؤن چڑھائے پھرتی ہے عموماً گھر میں بچوں میں مصروف رہتی ہے اسے یہ سمجھا دیا گیا ہے کہ وہ گرہستن ہے ماں اور بیوی ہے۔ بہو ہے۔ بجنا سنورنا بازاری عورتوں کا کام ہے گھر کی بیویاں بن سنور کر کسی کو لبھاتی نہیں۔

اس کہانی کو بیان کرنے والی بھی واحد متکلم حاضر لڑکی ہے وہ عورت جو شادی کے بعد بھدی اور بے ڈول ہوگئی ہے وہ بھابی ہے اور اس عورت کا شوہر بھیا — بھابی کے برخلاف اسکا بھیا بڑی احتیاط سے زندگی گذارتے ہیں غذاؤں کے استعمال میں احتیاط کے ساتھ ساتھ ورزش بھی کرتے ہیں۔ بھیا پڑوس کی ایک لڑکی شبنم میں دلچسپی لیتے ہیں جو کسی امریکن رسالے کا ماڈل معلوم ہوتی ہے۔ بھیا شبنم سے شادی کر لیتے ہیں اور بھابی کو طلاق دے دیتے ہیں دیکھتے ہی دیکھتے ایک عورت کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ شبنم سے شادی کے بعد بھیا سات آٹھ برس تک باہر رہ کے گھر لوٹتے ہیں تو شبنم گوشت کا ڈھیر بن چکی ہے اور بھیا ویسے ہی چٹان کی طرح ہیں۔ اب بھیا ایک چھریرے بدن کی متناسب الاعضا رقاصہ میں دلچسپی لینے لگتے ہیں اور شبنم کا بھی وہی حشر ہوتا نظر آتا ہے جو بھابی کا ہوا۔

عصمت نے عورت سے متعلق ہر مسئلہ کا احاطہ کیا۔ کوئی مسئلہ ان کے تیز مشاہدے سے بچ نہیں سکا۔ اس افسانے میں عورت نا کردہ گناہوں کا خمیازہ بھگتنے پر مجبور ہو جاتی ہے پہلے تو ہر اعتبار سے عورت کو یہ سمجھایا جاتا ہے کہ شادی کے بعد اسے خوب صورت اور دلکش نظر آنے کی ضرورت نہیں۔ بعد پھر اسی عورت کو طلاق دی جاتی ہے اس کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ بھدی اور بے ڈول ہوگئی ہے۔ مردانہ سماج میں عورت کو معمولی معمولی خواہشات کی تکمیل پر کس طرح قربان کر دیا جاتا ہے اس کا بڑا ہی موثر نقشہ عصمت نے کھینچا ہے۔ بھیا جب بھابی کے طلاق کے کاغذات تیار کر لیتے ہیں مہر کی رقم کے بدلے ایک مکان اس کے

نام کر دیتے ہیں بچوں کا بورڈنگ میں انتظام کر دیا جاتا ہے تب بھابی اپنی نسوانیت کو پوری طرح بے آبرو کر کے بھیا کے پیروں میں لوٹ جاتی ہیں اور کہتی ہیں ''تم اس سے شادی کرلو میں کچھ نہ کہوں گی مگر خدا کے لئے مجھے طلاق نہ دو میں یوں ہی زندگی گذار دوں گی مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی'' مگر بھیا نے نفرت سے بھابی کے تھل تھل کرتے جسم کو دیکھا اور منہ موڑ لیا۔

اس مروجہ سماج میں وہی عورت قابلِ عزت سمجھی جاتی ہے جو ہر حال میں اپنے شوہر کے ساتھ رہے طلاق شدہ عورت کو سماج نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس لئے عورت شدید ترین توہین برداشت کر کے بھی یہ نہیں چاہتی کہ وہ مطلقہ کہلائے۔

اس ایک مرد کے سامنے دوسری عورتیں بھی بے بس ہیں ماں اس لئے خاموش ہے کہ شوہر کے مرنے کے بعد ان کی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی۔ بھیا خود مختار ہے اور سب کے سرپرست بھی۔ وہ جانتی ہے کمائی پوت اپنا آپ مالک ہوتا ہے۔ کہانی کی راوی لڑکی بھی بے بسی سے سب کچھ دیکھتی رہ جاتی ہے۔ شبنم ہے جو یہ جانتی ہے کہ شادی سے قبل یہی عورت جسے طلاق دی جارہی ہے خوب صورت نازک، پڑھی لکھی اور سگھڑ اور بہت ہی نازک اور چھریرے بدن کی تھی اسے محض اس لئے طلاق دی جارہی ہے کہ وہ بھدی ہے اور بے ڈول ہوگئی ہے۔ عصمت نے ہندوستانی سماج کے اس تاریک پہلو پر روشنی ڈالی جہاں عورت پر صرف مرد ہی ظلم نہیں کرتے بلکہ عورت بھی عورت پر ظلم کرتی ہے۔

عصمت نئے دور کی لڑکی کو اس خطرے سے آگاہ کرتی ہیں اگر وہ صحت جسمانی کا خیال نہیں رکھے گی تو اپنے شوہر کو کھو دے گی۔ ہندوستانی عورت شادی کے بعد یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتی ہے کہ اسے اس کا شوہر ہر حال میں پسند کرتا رہے گا وہ یہ سمجھتی ہیں کہ سماجی بندھن شوہر کو ایسا کوئی بھی قدم اٹھانے پر سختی سے جکڑ لیں گے لیکن کبھی کبھی برے نتائج سامنے آتے ہیں۔ بھابی اور شبنم جیسی خوبصورت اور پڑھی لکھی عورتیں اس نازک سے نکتے کو سمجھ نہیں پاتیں کہ مرد کیا چاہتا ہے اور اپنی زندگیاں برباد کر لیتی ہیں۔ مرد کی بھونرے جیسی فطرت کو بھی عصمت نے اس افسانے کا موضوع بنایا۔

گھریلو زندگی کے مسائل کے علاوہ عصمت نے بیرونی یا خارجی دنیا کے نسائی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ہندوستانی معاشرے میں ملازمت کرنے والی عورت کی حیثیت ایسا ہی ایک موضوع ہے جو شہری زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔

''بے کار'' میں عصمت نے ایک ایسی عورت کے مسائل کو پیش کیا جو افراد خاندان کو فاقوں سے بچانے کے لئے ملازمت کرتی ہے۔ پہلے شوہر کی ملازمت اس کی لاپرواہی سے ختم ہو جاتی ہے دوسری ملازمت نہیں ملتی گھر کے سارے زیور فروخت ہو جاتے ہیں لیکن تین محاذوں پر اسے سخت کشمکش کرنی پڑتی ہے یہ محاذ اسکول، پڑوس اور گھر ہیں۔ اسکول کے حکام اس کی معاشی مجبوریوں کا استحصال کرتے ہیں پڑوس کی عورتیں اسے ایسی نظروں سے دیکھتی ہیں جیسے وہ بازاری عورت ہو۔ گھر میں ساس اور شوہر اس پر طعنے کستے ہیں اور اس کا جینا حرام کر دیتے ہیں۔ کوئی ایسا نہیں جو اس کی تعریف کرے کہ وہ زندگی سے پنجہ لڑا رہی ہے اور عزت کی زندگی گذارنے کی خاطر ملازمت کر رہی ہے۔

باقر میاں اپنی لاپرواہی سے ملازت کھو دیتے ہیں۔ ہاجرہ ان کی بیوی بحالتِ مجبوری نوکری کرتی ہے۔ باقر میاں کی پرورش روایتی اخلاقیات کے پس منظر میں ہوئی ہے۔ بیوی کے ملازم ہونے پر ان کے دوست ان کا مذاق اڑاتے ہیں ان کی بیوی کے کردار کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ باقر میاں ذہنی تناؤ کا شکار رہتے ہیں اور اسے اپنی ہتک سمجھتے ہیں ایک روز وہ شدید غصے کے عالم میں ہاجرہ پر ہاتھ اٹھا دیتے ہیں۔ ہاجرہ بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتی ہے۔ گھر کی فضا مکدر ہو جاتی ہے تناؤ بڑھ جاتا ہے باقر اور ہاجرہ ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ دونوں پیار کے ایک بول کے لئے ترس جاتے ہیں۔ ہاجرہ کا دم گھٹنے لگتا ہے وہ بیتے ہوئے دنوں کو یاد کر کے سوچتی ہے وہ دن کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے اور جب وہ رات میں سوتی ہے تو اسے ایسا لگتا ہے جیسے خدا نے اس کی سن لی ہے۔ ایک سایہ اپنے اوپر جھکا ہوا محسوس کرتی ہے۔ باقر میاں اسے سوتا دیکھ کر مڑ کے جانے لگتے ہیں تو ہاجرہ نے اس کی آستین پکڑ لی، سلیم کی طرح باقر میاں سسکیاں لیتے

ہوئے اس کے بازوؤں میں آجاتے ہیں ساری غربت ساری کثافت دو پیار کرنے والوں کے آنسوؤں نے دھوڈالے۔۔۔

لیکن وہ صبح کسی کے جھنجھوڑنے پر بیدار ہوتی ہے اور اس کے کان میں باقر میاں کی والدہ کی آواز آتی ہے۔

"اٹھ نصیبوں جلی تیرا ارمان پورا ہوگیا۔ ہائے ڈائن میرے لال کو کھا گئی۔"

یہاں بھی عورت ہی کو قصوروار ثابت کیا جاتا ہے۔ یہ افسانہ روایتی اخلاقیات کے خلاف شدید ردعمل ہے۔ اس میں عصمت نے کسی کردار کو قصوروار نہیں ٹھہرایا۔ بلکہ سماج کے کھوکھلے اصول عورت کا جینا دوبھر کردیتے ہیں اور اس کی آزادانہ حیثیت کو تسلیم نہیں کرتے باقر میاں کی ملازمت کے جانے کے بعد ہاجرہ ملازمت کرنا چاہتی ہے تو اس کی ساس سخت اعتراض کرتی ہے۔ باقر میاں کہتے ہیں "وہ کوئی اور الو کے پٹھے ہوں گے جو بیوی کی کمائی کھاتے ہوں گے" جب ہاجرہ ملازمت کرنے لگتی ہے تو باقر میاں کے دوست انہیں یہ باور کروانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسکول کی ساری استانیاں بدکردار ہوتی ہیں یہ اسکول دراصل چکلے ہیں۔ استانیوں کے بارے میں متوسط طبقے کے مرد کتنے گھٹیا خیالات رکھتے ہیں عصمت نے اس کی سچی تصویر دکھائی ہے۔ "لاحول ولاقوۃ ارے یار استانیوں کو دیکھ کر قئے آتی ہے سالیاں کالی کتھری، اجاڑ صورت یہ ممبر سسرے بھی گھامڑ ہوئے ہیں۔ پورے عشق بھی لڑاتے ہیں تو کیا تھرڈ کلاس مال سے، یار یہ ہمارے محلے میں ایک سالی استانی ہے پیٹ بھر کے بدصورت، بکری کی سی کالی کالی ٹانگیں، برقعہ میں سے نکلی ہوئی جب میرے گھر کے سامنے سے گذرتی ہے میں لونڈوں سے کہتا ہوں لٹادو سالی پہ کتا یار بڑا مزا آتا ہے لنگڑ سے کوے کی طرح پھدکتی بھاگتی ہے بڑی پارسا بنتی تھی سالی کو پیٹ رہ گیا۔ نکالی گئی محلے سے جوتے مار کے۔" [1]

یہ متوسط طبقے کا مرد ہے جو محنت کش عورت کے بارے میں نہ صرف برا سوچتا ہے بلکہ اسے راستے میں تنگ کر کے خوش بھی ہوتا ہے۔ باقر میاں ایسی باتیں سن سن کر اندر

---

[1] بے کار — دوشیزہ نومبر ۱۹۷۶۔ کراچی — ص۔ ۵۷

ہی اندر سلگتے جاتے ہیں اور سارا غصہ بیوی پر اتارتے ہیں گالی گلوچ پر تک اتر آتے ہیں۔ باجرہ اس ذہنی تناؤ کی وجہ فرائض کی انجام دہی ٹھیک سے نہیں کر سکتی۔ اسکول میں تاخیر ہوتی ہے اور تاخیر سے گھر لوٹنے پر شوہر اور ساس کے طعنے سننے پڑتے ہیں۔ باقر میاں اس پر ہاتھ اٹھاتے ہیں تو وہ بھی خاموش نہیں رہ سکتی جلی کٹی سناتی ہے۔ عصمت نے ایک محنت کش عورت کے کرب کو بڑی عمدگی سے پیش کیا اور مردانہ سماج کا دوسرا رخ پیش کیا اگر مرد کما کر لاتا ہے تو اس کے عوض یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ بیوی اسے پیار دے اس کی خدمت کرے۔ گھر اس کی مرضی سے چلتا ہے۔ لیکن عورت اگر گھر کو فاقوں سے بچانے کے لئے کمانے نکلتی ہے تو بجائے اس کے کہ اس کی حوصلہ افزائی کی جائے اس کے اس جذبے کی تعریف کی جائے۔ اس کا بھی اسی طرح خیال رکھا جائے جیسے کماؤ مرد کا رکھا جاتا ہے، اسے سماج حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ جیسے وہ بازاری عورت ہو۔ اور وہ پاک دامن گرہستنیں! کیا گھر بھر کو بھوکا مر جانے دیتی؟ اس طرح اس کی پارسائی بڑھ جاتی؟ اس کا کوئی نہیں ساس جو ایک عورت ہے وہ بھی اس کی مجبوری کو نہیں سمجھتی نہ شوہر ہی اس کا احسان مند ہے۔ محلّے کے مرد الگ تنگ کرتے ہیں حالانکہ انہیں اس کا احسان مند ہونا چاہیے کہ وہ ان کی جنس کے ایک فرد کا کام انجام دے رہی ہے۔ ایک کمانے والا مرد فرعون اور کمانے والی عورت مجرم کیوں؟ ایسے سوالات ہیں جو عصمت مردانہ سماج کے ٹھیکے داروں سے کرتی ہیں۔ عصمت کی نسائی حسیت کا روشن پہلو یہ ہے کہ وہ کسی جانب داری سے کام نہیں لیتیں بلکہ وہ عورت کو بھی قصور وار سمجھتی ہیں جس نے آنکھیں بند کر کے مردانہ سماج کی خرابیوں کو تسلیم کر لیا ہے۔ اور جب باقر میاں گھٹ گھٹ کر مر جاتے ہیں تو ان کی ماں ان کی موت کا الزام بھی باجرہ پر رکھتی ہیں کہ وہ ان کے بیٹے کو کھا گئی۔ ایک بے قصور عورت اس مروجہ سماج میں گھٹن اور کرب سے گذرتی ہے۔

''سزا'' میں بھی عصمت نے ملازمت کرنے والی لڑکی کے مسائل پیش کئے ہیں جس کے کندھے پر پورے کنبے کا بار ہے۔ وہ یتیم ہے۔ اس کا جوان بھائی ایک حادثے

میں مر گیا ہے۔ ماں ہر کوشش کر کے تھک گئی ہے۔ وہ سلائی کرتی ہے کڑھائی کرتی ہے سوئٹر بُنتی ہے لیکن اس سے گھر نہیں چلتا۔ مجبوراً شما کو ملازمت کرنی پڑتی ہے۔ جس جگہ شما نوکری کرتی ہے اس دفتر کے آفیسر کی نیت ٹھیک نہیں ہے شما نوکری چھوڑنا چاہتی ہے لیکن اس کے ماموں کھنہ جو اینٹی کرپشن بیوریو میں ہیں اور منگیتر اجیت اسکیم بناتے ہیں کہ اس آفیسر کو سزا دینا چاہیے۔ اسکیم یہ بنتی ہے کہ وہ شما کو آفیسر کے پاس بھیجیں گے اور میں موقع پر اس آفیسر کو رنگے ہاتھوں پکڑلیں گے۔ اسکیم کامیاب رہتی ہے آفیسر پکڑا جاتا ہے لیکن شما بدنام ہو جاتی ہے۔ کھنہ اسے دلاسہ دیتے ہیں کہ جب کیس چلے گا اور فیصلہ ہوگا تو دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔ آفیسر کا مقدمہ بند عدالت میں چلتا ہے اس لئے کسی کو پتہ نہیں چلتا کہ کیا ہو رہا ہے شما محلے والوں کو جواب دیتے دیتے عاجز آجاتی ہے کوئی اس کی بات پر یقین نہیں کرتا۔ کیس چونکہ عدالت میں ہے اس لئے شما کو بھی نوکری سے معطل کر دیا جاتا ہے پروبیشن پر ہونے کی وجہ سے وہ ایک چوتھائی تنخواہ سے بھی محروم ہو جاتی ہے۔ اس کا منگیتر اجیت بھی چڑ چڑا ہو جاتا ہے کیوں کہ معاشی مجبوریوں کی وجہ سے وہ شادی نہیں کر پاتے۔ بالاخر ماما جی سے پتہ چلتا ہے کہ آفیسر کو سزا ہوگئی۔ اور سزا کے طور پر اس کو ترقی دے کر کسی اور جگہ بھیج دیا گیا۔ شما یہ سوچ کر رہ جاتی ہے کہ حکومت کی سزا اتنی حسین ہے تو پھر جزا کیسی ہوگی اور پھر اسے سزا کیوں نہیں دی گئی۔

عصمت نے اس افسانے میں بظاہر بیوریوکریسی یا فیتہ شاہی کو موضوع بنایا ہے۔ دوسری طرف انہوں نے مردانہ سماج کے کھوکھلے پن کو بھی دکھایا ہے صاحب اقتدار مرد رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا ہے تب بھی اس پر کھلی عدالت میں مقدمہ نہیں چلایا جاتا۔ سارے ثبوت ملنے پر اسے سزا کے طور پر ترقی دی جاتی ہے۔ دوسری طرف ایک بے قصور عورت کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ محلّے بھر کے طعنے سننے پڑتے ہیں وہ تنخواہ سے محروم ہو جاتی ہے وہ صرف اس بھروسے پر حق کی لڑائی لڑتی ہے کہ جب فیصلہ ہوگا تو لوگ حقیقت جان جائیں گے لیکن عوام کے سامنے کچھ آتا ہی نہیں۔ عصمت نے عورت کی کمزور حیثیت کو واضح کیا۔

"اصول بنانے والوں نے اصول بنائے اور مر لئے یہ نہ سوچا جب کسی گھرانے کا پالن ہار مر جائے تو کنیا نہ کما کر کھلائے تو کون کھلائے۔ بیٹے کے بعد بیٹی ہی کو کٹم کا پالن ہار بننا پڑے گا۔"

ملک میں پھیلے ہوئے کرپشن اور نئے زمانے میں عورت کا نیا روپ ملازم پیشہ لڑکیوں کے مسائل اور ان کی دی ہوئی قربانیوں کے بارے میں عصمت اس طرح سوچتی ہیں۔ "کرپشن کوئی مسّہ تو نہیں کہ گال پر سے کاٹ کر پھینک دو کینسر کی طرح رگ رگ میں پھیلا ہوا ہے اس لئے بہتر ہے کہ اسے نظر انداز کر کے دوسری روحانی قسم کی خرابیوں کی طرف توجہ دی جائے دیش سیواکوں کو چاہیے کہ دیواروں پر سے ننگے اشتہارات کھرچیں۔ کوکا کولا کے اشتہار پر جو نیم برہنہ عورت ہے جو شربت کے بجائے معلوم ہوتا ہے چولیاں بیچ رہی ہے اسے سلیقے سے دوپٹہ اڑھانا چاہیے ورنہ ساری قوم سیکس مینیاک ہو جائے گی۔"[1]

عصمت موجودہ معاشرے میں عورت کو بطور ماڈل استعمال کرنے اور اسے برہنہ پیش کرنے پر سخت احتجاج کرتی ہیں اور اسے عورت کی توہین سمجھتی ہیں۔

ان بیاہی لڑکے اور لڑکوں کو جو آزادی ملتی ہے اور باشعور ذہن اس آزادی کا محدود استعمال کرتا ہے تو اس کے نتائج کتنے خراب ہوتے ہیں عصمت نے اسے بھی پیش کیا۔ عصمت کا گھریلو ماحول اب بدل گیا ہے اب زوال پذیر جاگیر دارانہ مسلم متوسط گھرانہ نہیں رہا۔ ایک شہری ماحول ہے اب نانی اور دادی و خالہ پھوپھی کی اجارہ داری ختم ہو گئی ہے۔ اب بہت سی باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آتیں صنعتی زندگی کی ضروریات اور نزاکتیں وہ سمجھنے سے قاصر ہیں اس لئے ایک موقع پر شما اپنی ماں سے کہتی ہے کہ وہ ان باتوں کو سمجھ نہ پائے گی تو وہ احتجاج کرتی ہے۔

"لو جی اور سنو پہلے زمانے میں بڑے بوڑھے بچوں سے کہا کرتے تھے کہ تمہارے بتانے کی نہیں کیا الٹا زمانہ ہے آج دودھ پیتے بچے ہم بڈھوں پر حکم چلاتے ہیں"

---

[1] سزا دوشیزہ۔ نومبر ۱۹۷۶۔ کراچی ص۔۸۴

''پیشہ'' میں عصمت نے طوائف کو بالکل نئے زاویے سے دیکھا وہ گھریلو عورت کے مقابلے میں طوائف کو برتر سمجھتی ہیں۔ وہ اس پیشے کو اقتصادی مسئلہ سمجھتی ہیں وہ لکھتی ہیں
''اگر مجھے کسی وقت رنڈی پر پیار آتا ہے تو اس وقت جب وہ ناچ رہی ہو اس وقت وہ مجھے عین اس محنتی مزدور کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ جو پیٹ کی خاطر سرمایہ داری کے کولہو میں بیل کی طرح جتا ہے۔''

طوائف کے موضوع پر سرشار سے لے کر منٹو نے سب ہی نے لکھا لیکن ان سب نے مردانہ نقطہ نظر سے اس مسئلہ کا جائزہ لیا عصمت نے اس مسئلے کو عورت کی طرح سوچا۔
''ویسے تو عورت دوسری عورت سے وقت بے وقت جل ہی جاتی ہے مگر طوائف سے خدا کی پناہ—! عورت تو اپنا حصہ یعنی ایک مرد لے کر بازار سے ہٹ جاتی ہے مگر طوائف سے چھٹکارا نہیں جسے دکان سے اناج لیتے وقت عوام تو حسب ضرورت لے کر ہٹ جاتے ہیں مگر خاص لوگ بھر بھر بورے تہہ خانوں کے کلیجے میں اتار دیتے ہیں نتیجہ؟ اگر اکنومکس پڑھی ہے بس سمجھ لیجئے اناج کی کمی! تو یہ ہماری جنگ جو طوائفوں سے چلی آرہی ہے یہ بھی مزدور اور سرمایہ دار کی جنگ ہے دکھ جھیلیں بی فاختہ اور کوے میوہ کھائیں۔ کہتے ہیں ایک دن ایسا دہکتا ہوا آئے گا کہ سارے مزدور سرمایہ داروں کو پیس کر پھینک دیں گے اور ان کا سارا سرمایہ چھین لیں گے شاید عورتیں بھی اسی طرح حملہ کر کے ایک دن طوائفوں کا سرمایہ چھین لیں۔ شاید!

عصمت طوائف سے نفرت نہیں کرتیں وہ عصمت اور عفت کے تصور کو ڈھکوسلہ سمجھتی ہیں۔ وہ مشرقی تصور کے دھجیاں اڑاتی ہیں۔ انہوں نے اس مسئلے کو بھی پیش کیا کہ اقتصادی پریشانیوں سے مجبور ہو کر بعض شریف خاندان کی عورتیں بھی پیشہ کرنے پر مجبور ہیں۔ لیکن انداز مختلف ہے۔ جسم فروشی کو وہ خالص اقتصادی مسئلہ سمجھتی ہیں۔

عصمت اور پاکبازی کے اس تصور کو انہوں نے کھوکھلا دکھایا ہے اور ضرورت کے پیش نظر اس تصور میں کیسی گنجائش پیدا کر لی جاتی ہے اور اس کا جس طرح سے استحصال کیا جاتے ہیں دو افسانوں ''دو ہاتھ'' اور ''اللہ کا فضل'' میں مختلف ڈھنگ سے پیش کیا۔ وہ ہاتھ

نچلے طبقے کی کہانی اور اللہ کا فضل اونچے متوسط طبقے کی کہانی ہے۔ دونوں کا موضوع ایک ہے۔

''دو ہاتھ'' میں افسانے کا مرکزی کردار گوری مہترانی ہے۔ جس کا شوہر رام اوتار ملٹری میں بھرتی ہو کر چلا گیا ہے اس درمیان گوری کی جوانی رنگ لاتی ہے۔ رام اوتار کی ماں گوری کو مارتی پیٹتی ہے لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ گوری بچے کی ماں بن جاتی ہے اس درمیان رام اوتار کے واپس آنے کی خبر آتی ہے سارے لوگ شدید تناؤ محسوس کرتے ہیں کہ رام اوتار پر اس واقعہ کا جو ردِ عمل ہوگا اس کے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ لیکن رام اوتار واپس آکر کسی شدید ردِ عمل کا اظہار نہیں کرتا بلکہ وہ بچے سے پدرانہ شفقت کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے اس رویّے سے سب پریشان ہو جاتے ہیں بالآخر راوی خاتون کے والد جن کی حیثیت گاؤں کے مکھیا کی سی ہے رام اوتار کو بلا کر واقعہ کی بے حد سنجیدہ اور خطرناک نوعیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں رام اوتار جواب دیتا ہے سرکار بڑا ہو جاوے گا اپنا کام سمیٹے گا رام اوتار نے گڑگڑا کر سمجھایا دو ہاتھ لگائے گا تو اپنا بڑھاپا تیر ہو جائے گا۔ ندامت سے رام اوتار کا سر جھک گیا اور نہ جانے کیوں ایک دم رام اوتار کے ساتھ ابا کا سر بھی جھک گیا جیسے ان کے ذہن پر لاکھوں کروڑوں ہاتھ چھا گئے یہ ہاتھ حرامی ہے نا حلالی یہ تو بس جیتے جاگتے ہاتھ ہیں جو دنیا کے چہرے سے غلاظت دھو رہے ہیں اس کے بڑھاپے کا بوجھ اٹھا رہے ہیں۔ عصمت کے پاس جائز ناجائز، حرام و حلال کا کوئی تصور نہیں ہے وہ انسان کے بچے کو انسان سمجھتی ہیں حلالی یا حرامی نہیں۔ رام اوتار بے حس نہیں ہے لیکن وہ سماج کے مروجہ اصولوں سے انحراف کرتا ہے۔ وہ بچے کو اپنے مستقبل کا ضامن سمجھتا ہے۔ عصمت عورت کو ماں بننے کا حق دینا چاہتی ہیں وہ بچے کی شناخت ماں کے ذریعے کرتی ہیں باپ کے ذریعہ نہیں۔ وہ جنسی تقاضوں اور معاشی ضرورتوں کو الگ الگ خانوں میں رکھتی ہیں۔ عورت کو ذاتی ملکیت سمجھنے کے تصور سے بھی انہیں اختلاف ہے۔

''اللہ کا فضل'' میں بھی عصمت نے ایک ایسا ہی موضوع نئے زاویے سے دہرایا۔

جس طرح انسان اپنی ضرورت کی چیزیں بازار سے خریدتا ہے عصمت ضرورتاً بچوں کو بھی کسی بھی مرد سے حاصل کرنے کی قائل ہیں۔ان کے پاس صرف ماں کی اہمیت ہے باپ کی نہیں۔

سکینہ کی دو لڑکیاں فرحت اور رضیہ ہیں۔ دونوں شادی کے قابل ہیں۔ مالی حالات سے مجبور ہو کر وہ فرحت کی شادی ایک دولت مند ساٹھ پینسٹھ برس کے بوڑھے سے کر دیتی ہے۔جس کی ایک بیوی اور چار لڑکیاں پہلے سے موجود ہیں۔سیٹھ کو ایک لڑکا چاہیے جوان کی دولت کا وارث بن سکے۔ چھ برس گذر جانے کے بعد بھی فرحت ماں نہیں بنتی۔ ڈاکٹر فرحت میں کوئی عیب نہیں بتاتے۔سکینہ بیگم میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ سیٹھ امداد میاں کو چیک اپ کے لئے کہہ سکیں ان کے خیال کے مطابق مرد ذات میں کوئی عیب نہیں ہوتا امداد میاں کے لئے آج بھی اچھی لڑکیوں کے رشتے ہیں۔کہانی کی راوی خاتون چاہتی ہے کہ فرحت اس بوڑھے کھوسٹ کو چھوڑ کر کسی اچھے نوجوان سے شادی کر لے۔اس کی نظر میں انور میاں ہیں وہ فرحت اور انور کی جوڑی بنانے کی تمنا کرتی ہے۔راوی خاتون اور سکینہ گھیر گھیر کر انور اور فرحت کو ایک دوسرے کے قریب کرتے ہیں اس قربت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے پیار کرنے لگتے ہیں۔کہانی کی راوی خاتون چاہتی ہے کہ فرحت امداد میاں سے طلاق لے کر انور سے شادی کر لے لیکن سکینہ اس بات کو ٹالتی ہے کیوں کہ اس میں ان کی بدنامی ہوگی اور چھوٹی لڑکی رضیہ کی شادی نہیں ہو پائے گی وہ پھر سے اقتصادی پریشانیوں میں پھنس جائیں گی۔ راوی خاتون فرحت کو سمجھاتی ہے کہ اگر ماں نہیں مانتی تو وہ خود طلاق لے سکیں فرحت میں ہمت نہیں وہ امداد میاں سے بہت گھبراتی ہے۔انور اور فرحت کی قربت رنگ لاتی ہے اور فرحت ماں بننے والی ہے۔ جب راوی خاتون دونوں کی شادی کی تیاریاں مکمل کر لیتی ہیں تو سکینہ فرحت کے ساتھ کہیں غائب ہو جاتی ہیں۔ کچھ دن انور فرحت کو دیوانوں کی طرح تلاش کرتا ہے پھر وہ شادی کر لیتا ہے۔ برسوں راوی خاتون سے سکینہ بیگم کی ملاقات ہوتی ہے سکینہ بیگم کے رکھ رکھاؤ اور صحت میں نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اٹلی، فرانس، سوئٹزرلینڈ کی سیر کر چکی

ہیں۔فرحت کے بارے میں وہ بتاتی ہیں کہ وہ اپنے شوہر امداد میاں کے ساتھ بہت مزے میں ہے اس کا بیٹا نادر بالکل باپ پر گیا ہے۔راوی خاتون اس سے پوچھتی ہے کیا امداد میاں پر،تو سکینہ بیگم ہنس کر کہتی ہیں کیا آپ نہیں جانتیں وہی چٹا رنگ اور نیلی آنکھیں ہیں۔ جب وہ پوچھتی ہے کہ امداد میاں کو شک تو نہیں ہوا تب سکینہ جواب دیتی ہیں'' اے ہٹایے بھی دنیا جہاں کے مردودے جب اپنی اولاد پر شک کرنے لگیں تو۔۔۔بس اب جانے بھی دیجئے اتنی عقل اپنی گرہ میں ہوتی تو میری معصوم بچی پر الزام نہ تھوپتے اپنے بڈھے گریبان میں بھی ایک بار جھانک کر دیکھتے'' راوی خاتون انور کے کرب کے بارے میں بتاتی ہے تو سکینہ بیگم کہتی ہیں ''بس جانے دیجئے یہ جو گلی گلی بچے ٹپکاتے پھرتے ہیں تب کلیجہ نہیں پھٹتا جیتا رہے اللہ اسے درجنوں بچے دے راوی خاتون حیرت سے سوچتی ہے کہ انور خواہ مخواہ ہی برسوں ضمیر کی علامت سہتا رہا جسے وہ اپنی نادانی سے گناہِ عظیم سمجھ بیٹھا تھا وہ تو عین ثواب تھا۔''

عصمت کا یہ افسانہ ان کے نظریات کا مظہر ہے۔وہ گناہ اور ثواب کو اضافی چیز سمجھتی ہیں۔گناہ کے لئے بھی سلیقہ چاہیے۔وہ محبت کو جذبات کی انتہا نہیں سمجھتیں۔ان کے پاس محبت کے کوئی معنیٰ نہیں ہیں۔سکینہ کو فرحت کے لئے ایک بیٹا چاہیے تھا جو امداد میاں کی جائیداد کا وارث کہلاتا امداد میاں میں بیٹا پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں تھی اس لئے سکینہ بیگم نے امداد میاں کے لئے انور کا بیٹا حاصل کیا۔عصمت یہاں مرد کے کمزور موقف کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں۔مرد کے پاس جسمانی یا کسی اور طرح کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا کہ وہ وثوق سے یہ کہہ سکے کہ فلاں بچہ اس کا اپنا ہے ——باپ کہلانے کے لئے اسے عورت کی گواہی کی ضرورت ہے۔اس کمزور موقف کا عورت با آسانی استحصال کر سکتی ہے۔بیگم نے یہی کیا۔وہ جانتی ہیں دولت امداد میاں کے پاس ہے اور محبت و جوانی انور میاں کے پاس۔ وہ جنسی ضرورت اور معاشی ضرورت کو الگ الگ خانوں میں رکھتی ہیں۔انہیں دولت اور دولت کا وارث چاہیے اس لئے انہوں نے جو شئے جہاں سے حاصل ہو سکتی ہے اپنے لئے حاصل کر لی۔عصمت کی نسائی حسیت اس بات پر زور دیتی ہے کہ بچے کی شناخت ماں کے

ذریعہ ہے جو عین فطرت کے مطابق ہے۔

''پتھر دل'' میں بھی عصمت نے بمبئ جیسے صنعتی شہر کی زندگی پیش کی جہاں عورت اپنے جسم کے سہارے لاکھوں روپیہ کما سکتی ہے۔ آنٹی ایک ایسی ہی دولت مند خاتون ہیں۔ وہ مسز نورانی کہلاتی ہیں۔ اپنی رشتہ دار کی یتیم لڑکی تہمینہ کو شہر لاتی ہیں۔ اسے بورڈنگ اسکول میں رکھتی ہیں۔ چھٹیوں میں دہرادون و نینی تال میں بھیجتی ہیں۔ اسے بی۔ اے کرواتی ہیں۔ تہمینہ تعلیم مکمل کر لیتی ہے اور آنٹی کے پاس لوٹ آتی ہے۔ گفتگو میں پتہ چلتا ہے کہ جوانی کے ساتھ ساتھ مسز نورانی نے دولت بھی گنوا دی ان کا بنگلہ اور ساری جائیداد سیٹھ کے پاس رہن ہے۔ ان کا گھر قحبہ خانہ بنا ہوا ہے۔ مسز نورانی چاہتی ہیں کہ تہمینہ سیٹھ کی داشتہ بن کر رہے اور پھر سے دولت کی ریل پیل ہو جائے لیکن تہمینہ انکار کر دیتی ہے وہ دولت کو ٹھکرا دیتی ہے وہ کہتی ہے کہ اپنی محبت کے بل پر وہ چھوٹی موٹی آمدنی میں زندگی بسر کرے گی۔ مسز نورانی اسے سمجھاتی ہیں کہ کسی تھرڈ کلاس شوہر کی بیوی بننے سے فرسٹ کلاس سیٹھ کی داشتہ بننا بہتر ہے۔ وہ تہمینہ سے اپنے احسانوں کا بدلہ چاہتی ہیں لیکن تہمینہ انکار کر کے ایک نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔ پلیٹ فارم پر مسز نورانی آجاتی ہیں اور اس کی ہمسفر بن جاتی ہیں۔

عصمت نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مردانہ سماج میں اور صنعتی ترقی کے دور میں عورت اپنے جسم کو بیچ کر بے پناہ دولت پا سکتی ہیں لیکن جوانی کے بعد اس کا بڑھاپا بڑا قابلِ رحم ہوتا ہے۔ ان شہروں میں پیسہ ہی سب کچھ ہے پیسے کے بل پر وہ نیک نامی خریدتے ہیں وہ چندہ دیتے ہیں اور اسکولوں اور یتیم خانوں کی کمیٹیوں کے ٹرسٹی بن جاتے ہیں۔ پیسے سے دوسری دنیا کا سامان بھی کر لیتے ہیں وہ آب زم زم میں ڈوبا ہوا کفن جس پر زعفران سے سات کلمے لکھے ہوں مسز نورانی کے لئے منگوانے کا وعدہ کرتے ہیں۔ لیکن اندر سے یہ لوگ کھوکھلے ہو جاتے ہیں اور ذہنی آسودگی حاصل نہیں کر پاتے وہ دنیا کو دھوکہ دے سکتے ہیں لیکن اپنے آپ کو فریب نہیں دے سکتے وہ جانتے ہیں کہ اس ثواب اور

نیک کام جو وہ انجام دے رہے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے۔ چنانچہ ساری زندگی آسائشوں کے حصول کو سب کچھ سمجھنے والی مسز نورانی ایک اولوالعزم لڑکی کے سامنے ہار جاتی ہیں۔ عصمت یہ بتانا چاہتی ہیں کہ اس سرمایہ دارانہ نظام میں بھی انسان اگر چاہے تو باعزت زندگی بسر کر سکتا ہے۔ وہ جسم فروشی پر محنت کشی کو ترجیح دیتی ہیں۔

عصمت کا ایک اچھوتا اور خوبصورت افسانہ ''زہر کا پیالہ'' ہے اس میں انھوں نے ٹوٹتے ہوئے جاگیردارانہ معاشرے کی ایک عبرت ناک تصویر پیش کی جس میں عورت مرد کے ظلم کا شکار ہو کر تباہ ہو جاتی ہے۔ یہ مسئلہ ہے دودھ پلانے والی انا کا— کہانی کی راوی خاتون کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے ہے جہاں بچوں کی کثرت ہے۔ کہانی کی راوی خاتون کی پیدائش کے بعد ایک انا مقرر کی جاتی ہے جس کا نام ٹیکو ہے۔ وہ اپنے بچے کو چھوڑ کر غریبی سے مقابلہ کرنے یہاں آ جاتی ہے ادھر اس کا لڑکا سوکھے کی بیماری کا شکار ہو جاتا ہے ادھر راوی لڑکی' انا کا دودھ پی پی کر صحت مند ہو جاتی ہے۔ اس کا حقیقی لڑکا خاک، مٹی، کوڑا کرکٹ، مرغیوں کی بیٹ، پھل ترکاری کے چھلکے جو ہاتھ آ جائے کھا کھا کر زندگی گذار رہا ہے۔ انا کو اس کے شوہر سے ملنے نہیں دیا جاتا۔ جب اس کا شوہر فطری تقاضے سے مجبور ہو کر اس سے ملنے آتا ہے تو اسے تھانہ دار کی مدد سے دنگا فساد برپا کرنے کے الزام میں پکڑوا دیا جاتا ہے۔ اس تجرّد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انا داروغہ کی ہوس کا شکار بن جاتی ہے۔ نتیجے میں اسے گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔ ایک عرصہ بعد انا آتی ہے اور بتاتی ہے کہ اس کے شوہر کو جب اس کے کرتوتوں کا پتہ چلا تو اس نے ایک نٹنی سے دوسری شادی کر لی اور اسے گھر سے نکال دیا۔ اس نے اپنے لڑکے کو رجھانے کی کوشش کی تو وہ اور بھی اس سے دور ہو گیا المونیم کا کٹورہ ہی اس کا سب کچھ تھا پھر وہ بھی مر جاتا ہے۔ صرف ایک کام کی وجہ سے اس کی پوری زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ آخر میں جب وہ گھر آتی ہے تو پاگل ہو چکی ہوتی ہے۔ عصمت نے ایک عورت کے کرب کو پیش کیا۔ عورت بے قصور ہے۔ اقتصادی و مالی مشکلات کو دور کرنے کے لئے اس کا شوہر اسے زبردستی ملازمت کے لئے بھیجتا ہے۔ وہ انکار کرتی ہے اپنے بیٹے

کی یاد میں روتی ہے تو اسے ڈرایا دھمکایا جاتا ہے۔ انا پر خاص نظر رکھی جاتی تھی وہ سال میں صرف دو بار گھر جا سکتی تھی۔ مغلانی بی اور داروغہ جب بھی ساتھ جاتے اور اس پر سخت نظر رکھتے کہ وہ اپنے شوہر سے ملنے نہ پائے ان کے جذبات کے درمیان آٹھ روپے، روٹی، کپڑا آجاتے۔ اس کا لڑکا مختلف بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ ٹیکو سب کو فائدہ پہنچاتی ہے اور خود نقصان اٹھاتی ہے۔ ٹیکو کا شوہر اس کی ساس، داروغہ جی سب اس کا استحصال کرتے ہیں لیکن زندگی ٹیکو کی تباہ ہو جاتی ہے۔ جاگیردارانہ معاشرے کی ایک رسم نے کتنی عورتوں کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا اسے ایک عورت ہی محسوس کر سکتی یا کروا سکتی ہے سو عصمت نے اس اچھوتے موضوع کو منتخب کیا۔ عصمت نے ٹیکو کے بیٹے کی بڑی عمدہ تصویر کھینچی ہے۔

''المونیم کا ایک ٹیڑھا کبڑا پیالہ اس کی کل جمع پونجی تھی اس پیالے سے اس کی کربناک زندگی کی جملہ رعنائیاں وابستہ تھیں۔ یہ پیالہ اس کی ماں تھا یہاں اس کا ان داتا۔ اگر گھڑی بھر کو پیالہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا تو وہ یتیموں کی طرح ہائے واویلا مچانے لگتا اسے کلیجے سے لگائے بغیر اسے نیند نہیں آتی تھی جب اسے بھوک لگتی جو ہر وقت ہی لگتی رہتی تھی تو وہ دونوں ہاتھوں سے پیالہ بجاتا، کبھی بندر کی طرح زمین پر گھستا فقیروں کی طرح لوگوں کو دکھا کر اس میں کھانا ڈالنے کی تلقین کرتا کتنا ہی کھلاؤ ازلی بھوک قائم رہتی۔ .... یہ پیالہ اس کا کھلونا بھی تھا ہمدم و دمساز بھی ــــ گھنٹوں بیٹھا اسے سوکھے سوکھے ہاتھوں سے ٹٹولا کرتا۔ جیسے بچے بسکٹ چباتے ہیں ایسے دودھ کے ننھے ننھے دانتوں سے کنارے چبایا کرتا۔ پھر غلاظت کی جھیل میں کٹورے پر منہ رکھ کر سو جاتا ــــ''

عصمت نے نچلے طبقے کے ایک ایسے لڑکے کی تصویر کھینچی ہے جیسے اپنی ماں کا پیار، گود کی گرمی اور سینے کا گداز نہیں ملا۔ اسے کسی کی توجہ کسی کا پیار نہیں ملا۔ نہ کبھی پیٹ بھر کھانا ہی مل سکا۔ اس لئے وہ پیالہ اس کی کل کائنات ہے۔ اس بے جان پیالے کے سہارے وہ جیتا ہے۔ عصمت نے ایک عورت اور بچے کی کرب کو محسوس کیا اور کروایا۔ ایک طرف بیٹے کی زندگی تباہ ہو گئی دوسری طرف ماں ایسے بے رحم حالات کا شکار ہوئی کہ پاگل ہو گئی ــــ

عصمت کے ہر افسانے میں نسائی حسیت ضرور جھلکتی ہے۔!

عصمت چغتائی کا سب سے بڑا وصف ان کا اسلوب ہے۔ فضیل جعفری لکھتے ہیں ”جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ سماجی تبدیلیوں کے باعث ایسے موضوعات جو مخصوص قسم کے ماحول یا واقعات یا نفسیاتی ردعمل سے جڑے ہوئے تھے اب بے روح ہو گئے ہیں لیکن عصمت کا اسلوب موضوع سے الگ ہٹ کر بجائے خود ایک ایسا بے تکلف اور تخلیقی اسلوب ہے جس نے ان کی افسانوی ادب کو بے روح نہیں ہونے دیا اسی اسلوب کی گرفت پورے افسانے پر موت کی طرح مضبوط رہتی ہے“ [1]

ڈاکٹر بیگ احساس عصمت کے اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں ”ان کے اسلوب میں ایک بے ساختہ پن اور سادگی و بہاؤ ہے عربی و فارسی کے مشکل الفاظ نہ نثر میں شاعری کی کوشش ــــ نہ لفظوں کی ملمع کاری ــــ! یو۔ پی کے مسلم گھرانوں کی عام بول چال میں وہ جنس کا تذکرہ بھی اس انداز سے کرتی ہیں کہ پڑھنے والے کو احساس ہوتا ہے کہ یہی گھٹن اس کے اندر تھی جو لفظوں میں عصمت نے بکھیری ہے۔ نثر کا یہ انداز عصمت سے شروع ہوا اور عصمت پر ہی ختم ہوا کوئی دوسرا مقلد پیدا نہ ہو سکا [2]

عورت کے حواس خمسہ مرد کے مقابلے میں زیادہ بیدار ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں عورت کے سارے جسم پر آنکھیں ہی آنکھیں ہوتی ہیں۔ اس کی قوت سماعت بھی بہت تیز ہوتی ہے۔ منٹو نے اپنے مضمون میں لکھا تھا ”عصمت غائت درجے ذکی الحس ہے ہلکا سا لمس ہی اس کے لئے کافی ہے عصمت کے یہاں آپ کو دوسری جسمانی حسیں بھی محو عمل نظر آتی ہیں مثال کے طور پر سونگھنے اور سننے کی حسیں۔ صوت کا تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں عصمت کے ادب سے بہت ہی گہرا تعلق ہے۔“ [3]

منٹو نے بالکل درست نشاندہی کی کہ عصمت کے ہاں حواس خمسہ کے مختلف

---

[1] فضیل جعفری — عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری — اردو افسانہ روایت — ص:۔ ۴۳۳

[2] بیگ احساس — عصمت چغتائی ایک جائزہ — آندھرا پردیش۔ اکتوبر ۱۹۸۶ء — ص۔ ۲۱

[3] سعادت حسن منٹو — ”عصمت چغتائی“ — بمبئی ۱۹۴۸ء — ص ۲۸

ردعمل کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ چند مثالیں پیش ہیں۔

''ٹھائیں۔۔۔ ننھے نے موقع پا کر بندوق چلائی (بھول بھلیاں)

''ٹنٹن ٹنن سائیکل کی گھنٹی بجی (پنکچر)

گھر۔گھر، پھٹ شوں، فش باہر برآمدے میں موٹر بھنا رہی تھی (پنکچر)

دھم۔دھم۔ چھن چھن کرتی ہوئی سیڑھیوں سے اتری۔ (ساس)

کوئی پون درجن بچے کھی کھی، کھی کھی، کھوں کھوں سب کھمبوں کی آڑ میں شرما شرما کے ہنسنے لگے۔ (ساس)

گھر گھر بھٹ پھٹ۔ بھڑ جھڑ معلوم ہوتا تھا جیسے اب نکلے اور اب نکلے۔ (سفر میں)

بچہ کوں کوں کر کے چپڑ چپڑ منہ مارنے لگا (سفر میں)

سن سن جیسے گولیاں چلیں دور چمگاڈر نے قہقہہ لگایا (تاریکی)

دھائیں، دھائیں، دھا۔۔۔ دھائیں اوہ یا۔۔۔ دھائیں، دھک۔۔۔ تھو۔ قریب کی دیوار پر کیچڑ کا سا پٹاخہ سنائی دیا اور پھر دھائیں دھائیں شروع ہوگئی۔ (نیرا)

کھٹا کھٹ، ٹوپ، ٹوپ، چھنن چھنن۔ ٹاپ ٹاپ چھنن چھنن یکہ سر پر آگیا (نیرا)

دھڑ — دھڑ — دھڑ ڈ — کوئی باہر دروازے کو کوٹ رہا تھا۔ (پردے کے پیچھے)

''شش — شی — شی — کھڑڑ — کھڑڑ پنچیں سرکیں اور سیاہ شیر دانیاں جیسے کھونٹوں پر لٹ گئیں۔ (پردے کے پیچھے)

ایسی بے شمار مثالیں ہیں جس میں عصمت اپنی قوت سماعت سے تاثر پیدا کرتی ہیں۔ عصمت نے اردو ادب کو عورتوں کی زبان اور کئی محاورے دیے ہیں جن سے اردو ادب خالی تھا۔ مضافاتی اور خاص طور پر گھریلو عورت کے طعنے تشنع، کوسنے، محاوراتی انداز بیاں

مختلف قسم کی گالیاں عورتوں کی زبان میں مختلف طبقوں کی زبان کا اختلاف اجاگر کرتی ہیں۔

ان کی تشبیہات میں بھی نسوانی رنگ ہے۔ جیسے:

نائیں نائیں میرے لال'' دبلی پتلی ماں اسے گھٹنے پر لٹا کر یوں ہلاتی جیسے دھان کے چاول سوپ میں پھٹک رہی ہو (چوتھی کا جوڑا)

''اس کے کپڑے جسم سے چپک گئے اور ان کے جسم کا سارا بھونڈا پن بھیانک طریقے پر ابھر آیا۔ کمر پر جیسے کسی نے توشک لپیٹ دی تھی۔'' (چٹان)

''بھابی کو روتے دیکھ کر بجائے دکھ کے ہنسی آتی تھی جیسے کوئی روئی کے بھیگے ہوئے ڈھیر کو ڈنڈوں سے پیٹ رہا ہو''۔ (چٹان)

''اس نے اس بری طرح اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا کہ خمیری آٹے کی طرح بہہ گئی تھی'' (چٹان)

''اب میں سمجھی تم نے مجھے کیوں اس لاڈ پیار سے پالا تحفوں کے ڈھیر لگائے پہاڑوں کی سیر کرائی ولایت بھیجا کہ ایک دن بیری پک جائے گی تو بانس لے کر جھاڑ لوگی''
(پتھر دل)

''یہ بھی مزدور اور سرمایہ دار کی جنگ ہے دکھ جھیلیں بی فاختہ اور کوے میوہ کھائیں''
(پیشہ)

''اوئی اب ایسی بھی کیا بلبلاہٹ ہے صبح ہوئی اور روٹی کا پٹنا پڑ گیا۔ ابھی چیل کوؤں نے کوڑا بھی نہ کریدا ہوگا۔ ایسا ہی ہے تو پیٹ سے روٹی باندھ کر سویا کرو۔''
(بچپن)

''دو ہاتھ ہیں ان سے کیا کیا کروں بچی ذرا چھری تلے دم تو لے شکر پر مری جا رہی ہے چیونٹی کہیں کی''۔ (بچپن)

ایسی بے شمار مثالیں ہیں۔ عورتوں کی زبان کے مخصوص الفاظ کا وہ بڑا خوبصورت استعمال کرتی ہیں۔

''اے ہے موئی بیاہی تباہی ڈھڈو نے نگوڑے بادشاہ کو پھانس لیا۔ منہ جلی کو لاج بھی تو نہ آئی میرا بس چلے تو خصمی (جس نے تین خصم کیے ہوں) کا چونڈا جھلس دیتی''

(روشن)

''اوئی بچے اس میں تکلیف کا ہے کی — اب میں ہی جوٹا نک دوں گی تو کیا موئے ہاتھ گھس جائیں گے میرے؟'' (ڈائن)

''خدا غارت کرے اس ڈائن قطامہ کو جو میری بچی کا گھر لگاڑے۔ میرے اللہ خدا کی مار اس.......... پر جو منیر دولہا کا دل میری بچی کی طرف سے پھیری یا اللہ میرے''

(ڈائن)

''الٰہی یا تو ان حرامی پلوں کو موت دے یا میری مٹی عزیز کرلے۔ نہ جانے یہ اٹھائی گیرے کہاں سے مزے کو آجاتے ہیں۔ چھوڑ دیے ہیں جن جن کے ہماری چھاتی پر مونگ دلنے کو—'' (ساس)

پڑھی لکھی خواتین کی زبان بالکل علیحدہ ہوتی ہے۔ وہ طبقاتی فرق کو بھی ملحوظ رکھتی ہیں۔ متوسط طبقے کی تعلیم یافتہ لڑکیاں گفتگو کرتی ہیں تو ان کی زبان مختلف ہوتی ہے۔ ''ہائے آنٹی جی! امی طلاق کے نام پر منہ پیٹے لیتی ہیں کہتی ہیں سنکھیا کھالوں گی''

''امی کمبخت کا تو بھیجہ پگھل گیا ہے۔ تم خود بالغ ہو طلاق لے سکتی ہو — اور پھر اب ایسے حالات میں تو — وہ راضی ہو جائیں گی۔'' (اللہ کا فضل)

عصمت مکالموں کے علاوہ خود بھی جب واقعہ کی تفصیل لکھتی ہیں تو عورتوں کی زبان استعمال کرتی ہیں۔ عصمت کا فن اشاروں کا فن ہے۔ اشارے عورت کی فطرت سے مطابقت رکھتے ہیں۔ بہت سی باتیں عورت اشاروں میں کہہ جاتی ہے یہی وصف عصمت کے فن میں موجود ہے۔ جیسے مرد کی دست درازیوں اور عصمت دری کے واقعہ کو عصمت اشاروں میں بیان کرتی ہیں۔

''ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پہاڑ کی کھوہ میں ڈوبتا چلا گیا۔ نیچے تعفن اور تاریکی

کے اتھاہ غار کی گہرائیوں میں ایک بڑی سی چٹان نے اس کی چیخ کا گھونٹ دیا۔ نیاز کے ملیدے کی رکابی ہاتھ سے چھوٹ کر لالٹین کے اوپر گری اور لالٹین نے زمین پر گر کر دو چار سسکیاں بھریں اور گل ہوگئی باہر آنگن میں محلے کی بہو بیٹیاں مشکل کشا کی شان میں گیت گا رہی تھیں'' (چوتھی کا جوڑا)

عصمت کی آواز اردو ادب کی وہ پہلی آواز تھی جس نے بھرپور نسائی حسیت کے ساتھ مردوں کو یقین دلایا کہ اسے موقع ملے تو وہ مردوں سے زیادہ بہتر انداز میں پوری سچائی کے ساتھ اپنے نقطۂ نظر سے معاشرے کی جھلکیاں پیش کر سکتی ہے۔ عصمت نے مردانہ سماج میں مردوں کے ظلم عورتوں کی دبی کچلی حیثیت، گھریلو زندگی کی گھٹن، جنسی مسائل، عورت کا عورت پر ظلم، گھر سے باہر کی دنیا میں عورت کے ساتھ برتاؤ ان تمام موضوعات پر پوری بے باکی، صداقت اور نڈرپن کے ساتھ لکھا یہ عصمت ہی کی فکر تھی جس نے سینکڑوں بلکہ ہزاروں ذہنوں کی پرورش اس طرح کی کہ آج اپنے معاشرے کی ہر غلط روایت سے انحراف کا حوصلہ پیدا ہوا۔ عصمت چغتائی کے افسانوں اور ناولوں میں جو نسائی حسیت کا اظہار ملتا ہے وہ کسی اور خاتون افسانہ نگار کے ہاں نہیں ملتا۔ عصمت خود ہی نقش اول بھی ہیں اور نقش آخر بھی!

☆☆☆

کتابیات

کتب

۱۔ ابوالکلام قاسمی — تخلیقی تجزیہ ۔ علی گڑھ ۔ ۱۹۸۶

۲۔ احسن فاروقی ڈاکٹر محمد — اردو ناول کی تنقیدی تاریخ
ادارہ فروغ اردو۔ لکھنو ۔ ۱۹۷۶

۳۔ امیر عارفی — نیاز فتح پوری۔ انجمن ترقی اردو ۔ دہلی ۔ ۱۹۷۷

۴۔ جنید احمد — شخصیات اور واقعات جنھوں نے مجھے متاثر کیا، جنید بک ہاوز، بمبئی

۵۔ خلیل الرحمٰن اعظمی — ترقی پسند ادبی تحریک۔ انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ ۔ ۱۹۷۶

۶۔ رشید جہاں — عورت اور دوسرے افسانے ۔ ۱۹۷۷

۷۔ سعادت حسن منٹو — عصمت چغتائی ۔ بمبئی ۔ ۱۹۴۸

۸۔ شمیم نکہت ڈاکٹر — پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار۔ دہلی ۔ ۱۹۷۴

۹۔ صادق ڈاکٹر — ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ۔ مکتبہ جامعہ۔ دہلی۔ ۱۹۷۴

۱۰۔ ضیا عظیم آبادی — ادب اور جنس ۔ اردو پبلشرز لکھنو ۔ ۱۹۷۹

۱۱۔ عزیز احمد — ترقی پسند ادب

۱۲۔ علی حیدر رسید — اردو ناول سمت و رفتار۔ شبستان ۔ الہ آباد ۔ ۱۹۷۷

۱۳ فرید وجدی آفندی — المراۃ المسلمہ ۔ اشاعت القرآن ۔ دہلی ۔ ۱۹۶۳

۱۴۔ قمر رئیس ڈاکٹر — تنقیدی تناظر۔ ایجوکیشنل بک ہاوس۔ علی گڑھ ۔ ۱۹۷۸

۱۵۔ کشن پرشاد کول — نیا ادب ۔ کراچی

۱۶۔ گوپی چند نارنگ — اردو افسانہ روایت اور مسائل
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس ۔ دہلی ۔ ۱۹۸۱

۱۷۔ مجنوں گورکھپوری — خواب و خیال ۔ ۱۹۵۵

۱۸۔ محمد حسن — اردو ادب میں رومانوی تحریک ۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ
۱۹۵۵

۱۹۔ نیاز فتح پوری — نگارستان ۔ نگار بک ایجنسی۔ لکھنو ۔ ۱۹۳۹

۲۰۔ نیاز فتح پوری — جمالستان ۔ نگار بک ایجنسی۔ لکھنو ۔ ۱۹۵۱

۲۱۔ نیاز فتح پوری — مذاکرات نیاز ۔ نگار بک ایجنسی۔ لکھنو ۔ ۱۹۳۹
(دوسرا ایڈیشن)

رسائل

۱۔	آندھراپردیش	حیدرآباد	اکتوبر، ۱۹۸۶
۲۔	پیام نسواں		۱۹۴۰
۳۔	دوشیزہ	کراچی	نومبر،۱۹۷۶
۴۔	شاعر	بمبئی	شمارہ ۳۰۵،۱۹۷۶
۵۔	عصمت	دہلی	۱۹۳۹
۶۔	معلم نسواں	حیدرآباد	جلد۸، ۱۹۳۲

مقالے

مغنی تبسم - نسائی تنقید ایک تعارفی نوٹ

انگریزی کتب

1. Firestone S. — The Dillitic of Sex, New York Bautam 1970
2. Fuller M. — The Wrongs of India Womenhood 1900
3. Gandhi M.K. — Women and Social Injustic
Navjavan publishing house, Ahmedabad-1970
4. Horner I.B. — Women and Primitive Budhism, London
5. Jame Caplan — Women is Society 1981
6. Kalapna Shah — Women's Liberation and Voluntary Action
New Delhi 1984
7. Kalpana Shah — Women's Liberation Subjugation
New Delhi1984
8. Kamla Devi Chattopadhyay — Women in India
9. Kaur Amrita — Women and Social Injustic
10. Manmohan Kaur — Role of Women in the Freedom Movement 1968
11. Mill John — Start the Subjection of Women M.I.T. press 1970
12. Mallik B. — The Hindu Family in Bengal, Calcutta 1882
13. Shakuntala Rao — Women in Vedic Age 1960
14. Surabhi Seth — Religon and Society in Brahama Purna 1979
15. Tara Ali Baig — Women in Amcient India
16. Vijay Lakshmi Pandit — The Status of Women in Ancient India

ISMATH CHUGHTAI KE NOVELOUN AUR AFSANAOUN MEIN NISAI HISSIYAT

by

Atiya Fatima

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
New Delhi , INDIA

ISBN 978-93-89002-96-6
978-93-89002-96-6
www.ephbooks.com